Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1973

اس پرچہ میں

(۱) مسوّدۂ آئین پر تبصرہ

(۲) پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

بدلِ اشتراک
پاکستان
سالانہ ـــــ دس روپے
غیر ممالک
سالانہ ـــــ ایک پونڈ

ٹیلیفون نمبر
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

جلد (۲۶) فروری ۱۹۷۳ء نمبر (۲)

فہرست

۱- لمعات ـــــ ۳
۲- محترم وزیر تعلیم (پنجاب) کی وضاحت ـــــ ۱۴
۳- نقد و نظر ـــــ (جدید عالم اسلام) ـــــ ۱۶
۴- کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟ ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۱۷
۵- بیادِ علامہ اسلم جیراجپوری ـــــ ۴۵
۶- طلوعِ اسلام نے کیا کچھ نہیں کہا ـــــ (آخری قسط) ـــــ (محترم محمد اسلام صاحب) ـــــ ۴۹

ایڈیٹر: محمد خلیل - ناشر: سراج الحق - مقامِ اشاعت: ۲۵/ بی گلبرگ ۲ - لاہور - پرنٹر: شیخ محمد اشرف - مطبوعہ: اشرف پریس ایبٹ روڈ لاہور

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ دیوبند کے ایک نوجوان خوشنویس نے اس کی کتابت کی۔ خط پاکیزہ تھا۔ پوچھنے لگا کہ کیا پسند آئے گا۔ میں نے کہا کہ خط تو پسند آ جائے گا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خطاط بھی نباہ کرے گا۔ کہنے لگا کہ خطاط تو عمر بھر نباہ کرنے کے ارادہ سے آیا ہے۔

یہ نوجوان خوشنویس تھے **منشی سید سعید احمد** — دیوبند کے نہایت ممتاز علمی گھرانے کے چشم و چراغ۔ شیخ الحدیث مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ترین عزیز۔ انہوں نے نہ صرف طلوعِ اسلام کی مسلسل کتابت کی بلکہ میری تصنیف معارف القرآن کے تمام حصوں کی کتابت بھی انہی کے تابندہ قلم کی رہینِ منت ہے۔

۱۹۴۸ء میں دفاتر کے ساتھ کراچی آنے لگا تو منشی جی سے با دلِ ناخواستہ الوداع کہا۔ انہوں نے کہا الوداع کیسے؟ میں تو عمر بھر نباہ کرنے کے لئے آیا ہوں — اور وہ اپنا گھر بار، اعزا و اقربا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ میرے ہمراہ کراچی آ گئے اور کراچی میں میرے ہی ہاں قیام کیا۔ وہ ہمارے خاندان کا ایک فرد بن گئے۔ میرا بہت سا بوجھ انہوں نے بانٹ لیا۔ وہاں بھی طلوعِ اسلام کے علاوہ میری تمام اہم تصانیف انہی کی قلمبند کی ہوئی ہیں۔ میں ۱۹۵۵ء میں مستقل طور پر لاہور آ گیا تو منشی جی بھی میرے ساتھ ہی لاہور تشریف لے آئے۔ یہاں علاوہ دیگر اہم تصانیف، مفہوم القرآن کی کتابت بھی انہی کی یادگار ہے۔ پھر انہوں نے سلسلۂ معارف القرآن کی تمام جلدوں کے نئے ایڈیشن ایک ایک کر کے لکھے۔ اب وہ اس کی آخری جلد — من و یزداں — کی کتابت کر رہے تھے کہ ۲۸ جنوری کی صبح ان کے ایک عزیز نے اچانک اطلاع دی کہ — "آپ کے منشی جی آپ کو سلام کہہ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ ان کی حرکتِ قلب بند ہو گئی" — میں خود صاحبِ فراش تھا۔ اس ناگہانی خبر سے ایک چکر آیا اور اس کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ میرے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ مرحوم کا آخری پیغام یہ تھا کہ "بابا جی سے کہنا کہ میں آخری کتاب کا آخری صفحہ مکمل کرنے کے بعد رخصت ہو رہا ہوں۔ میں نے اپنا قول نباہ دیا ہے۔ خدا آپ کو زندہ اور سلامت رکھے۔"

ہمارے منشی سعید نہ صرف ایک ماہرِ فن خوشنویس تھے بلکہ بڑی پاکیزہ سیرت اور بلند کردار کے حامل، شرافت کا مجسمہ، ہمدردی کا پیکر، فکرِ قرآنی کا مبلغ۔ ساری عمر نہایت محنت سے کمائی کی اور اپنے لئے کم از کم رکھ کر باقی سب صاحبِ احتیاج عزیزوں کو اس طرح دے دیا کہ دائیں ہاتھ سے دیا تو بائیں کو اس کی خبر نہ ہوئی۔

مرحوم طلوعِ اسلام کے حلقے ہی میں نہیں بلکہ میری (نجی) زندگی میں بھی ایک ایسا خلا پیدا کر گئے ہیں جس کا پُر ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جگر فگار
پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مسوّدۂ آئینِ پاکستان

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

انگریزی عملداری میں ہمارے ہاں ایک اصطلاح رائج تھی ــــ سرزمینِ بے آئین ــــ اس کا اطلاق ہوتا تھا سرحد پار کے اس علاقہ پر جہاں نہ کوئی آئین تھا نہ ضابطۂ قوانین ــــ وہ سرزمینِ بے آئین تھی۔ اُس زمانے میں ہم اس اصطلاح کو بڑے طنز و تشنیع کے ساتھ انگریز کے نظامِ حکومت کے خلاف استعمال کیا کرتے تھے۔ لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہی طنز ایک دن پلٹ کر خود ہمارے منہ پر تھپیڑ رسید کریگا۔ انگریز کے جانے کے بعد ہمیں آزادی ملی اور ہماری مملکت کا کوئی ایک علاقہ نہیں بلکہ ساری کی ساری سرزمین، بے آئین بن کر رہ گئی۔ دورِ ایوبی کی مختصر سی مدت کے سوا یہاں کوئی اپنا آئین ہی نافذ نہ ہو سکا۔ خدا خدا کر کے اب اس ضمن میں ایک نئی کوشش بروئے کار لائی جا رہی ہے اور حال ہی میں ایک جدید آئین کا مسودہ اسمبلی میں پیش ہوا ہے جس پر غور و فکر جنوری کے آخری ہفتے میں شروع ہوگا۔ مسودہ کے ساتھ ہی خاصے لمبے چوڑے اختلافی نوٹس بھی شائع کئے گئے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آئین کمیٹی کے اُن اراکین کی طرف سے ہیں جنہوں نے گذشتہ اکتوبر میں اتفاقِ رائے سے مسودہ کی تصویب کی تھی ــــ دوسری طرف حزبِ اقتدار کا کہنا ہے کہ یہ مسودہ تصویب شدہ آئین ہی کے مطابق ہے۔ چنانچہ اس مسودہ پر جھگڑے کی اینٹ پہلے ہی رکھ دی گئی ہے۔ معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا۔

آئین سازی کے سلسلے میں ہم گذشتہ پچیس سال سے اُن بنیادی اُصولوں کو شائع کرتے چلے آ رہے ہیں جن پر جاری قرآنی بصیرت کے مطابق 'اسلامی مملکت' کے آئین کو متشکل ہونا چاہیئے۔ آخری مرتبہ ان اصولوں کو طلوعِ اسلام بابت فروری ۶۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس مقالہ کو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں الگ الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی عام تقسیم کیا گیا تھا۔ ہم اس پمفلٹ کی کاپیاں مجلسِ آئین ساز کے اراکین کی خدمت میں ازسرِنو بھیج رہے ہیں۔ بنا بریں، زیرِ نظر مسودہ پر ہمارا تبصرہ چند موٹے موٹے نکات تک محدود ہوگا کیونکہ ہم نے تفصیل سے جو کہنا تھا اُن تصریحات میں کہہ چکے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

مقامِ تشکر

بات "الحمد" سے شروع کی جاتی ہے یعنی اُن دو تین نکات سے جن کی بنا پر ہمارے نزدیک اس مسودہ کے مرتب کرنے والے مستحقِ تبریک و ستائش ہیں۔ اس سے پہلے ہر آئین میں درج

ہونا تھا کہ مملکت کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہوں گے لیکن جہاں تک شخصی قوانین (پرسنل لاز) کا تعلق ہے، ہر فرقہ کی کتاب و سنت کی تعبیر اُن کی اپنی فقہ کے مطابق ہوگی۔ ہم اس شق کے خلاف شروع سے صدائے احتجاج بلند کرتے رہے کیونکہ پبلک لاز اور پرسنل لاز کی تفریق اسلام کے بنیادی ضابطہ کے خلاف اور فرقہ بندی قرآنی نص صریح کے مطابق شرک ہے۔ مقام تشکر تھا کہ صدر ایوب کے پیش کردہ آئین میں یہ شق حذف کر دی گئی تھی لیکن اس کے بعد مذہبی پیشوائیت (بالخصوص جماعت اسلامی) کی طوفان انگیزی کی وجہ سے اس مسودے میں ترمیم کی گئی اور اس غیر اسلامی اخلاف قرآن شق کو پھر سے آئین میں شامل کر لیا گیا۔ موجودہ مسودہ میں اس شق کو حذف کر دیا گیا ہے اور یہ امر بہر کیف موجبِ اطمینان ہے کہ علماء حضرات کی طرف سے اس کے خلاف کوئی احتجاجی نوٹ سامنے نہیں آیا۔ اس مستحسن اقدام پر ہم آئین کمیٹی کے جملہ ارکین کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کرتے ہیں۔

مسلمان کی تعریف

دوسرا نکتہ تحسین یہ ہے کہ حلف نامہ میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے حسب ذیل امور پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حلف نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

میں حلف اٹھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور حسب ذیل امور پر ایمان رکھتا ہوں۔

خدائے مقتدر کی وحدت اور واحدیت پر۔ خدا کی کتابوں پر جن میں سے آخری کتاب قرآن مجید ہے۔

حضرت محمدؐ کی نبوت پر اور اس امر پر کہ حضور خدا کے آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔

یوم آخرت پر اور قرآن و سنت کی تعلیمات و مقتضیات پر۔

(قرآن کی رُو سے ایمان کے اجزاء حسب ذیل ہیں۔ خدا، ملائکہ، انبیاء، کتب۔ اور یوم آخرت۔ طلوع اسلام)

مقام تشکر ہے کہ ختم نبوت کے عقیدہ کو ایمانیات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس عقیدہ کے بغیر کوئی شخص امتِ محمدیہ کا فرد قرار نہیں پا سکتا۔ اس اہم نکتہ کو پرویز صاحب نے اپنے اس مقالہ میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے جسے انہوں نے ("ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" کے عنوان سے) طلوع اسلام کی سابقہ کنونشن میں پیش کیا اور جو طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۷۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ نیز حلف نامہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "میں اسلامک آئیڈیالوجی کو جو تخلیقِ پاکستان کی بنیاد ہے، محفوظ و مستحکم رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

مسلمان ہونے کی شرط محدود

افسوس یہ ہے کہ حلف نامے میں مسلمان ہونے کی شرط صرف صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم تک محدود رکھی گئی ہے۔ باقی کسی کے لئے نہیں۔ حتیٰ کہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور جج صاحبان کے لئے بھی نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی مملکت میں ان مناصب جلیلہ پر از روئے آئین غیر مسلم بھی متعین کئے جا سکتے ہیں۔ ہماری بصیرت کے مطابق قرآن اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ یہی نہیں بلکہ قرآن کی رُو سے نہ کوئی غیر مسلم اسلامی مملکت کی آئین اور قوانین سازی کے امور میں شرکت کر سکتا ہے اور نہ ہی اُسے رموزِ مملکت میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ دو قومی نظریہ

دو قومی نظریہ

کا یہی عملی مفہوم ہے اور یہ واضح ہے کہ دو قومی نظریہ ہی تخلیقِ پاکستان کی اساس و بنیاد تھا۔ اسی کو نظر انداز کرنے سے مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس بنا پر مغربی پاکستان میں بھی الحاد و بے دینی کے جراثیم عام ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر مسودہ میں بھی اس اساسی اصول کو اسی طرح نظر انداز کیا گیا ہے جس طرح اس سے پہلے کے مرتب کردہ دساتیر میں کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ آئین بھی اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ اسلام کی رُو سے کوئی غیر مسلم اسلامی قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا۔ مملکت کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تصور کرنا، وہی نظریۂ وطنیت ہے جس کے خلاف ہم نے پاکستان کی تحریک اٹھائی تھی اور جس کی بنیاد پر ہم نے ایک جداگانہ مملکت حاصل کی تھی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مسز اندرا گاندھی اور تمام نہاد بنگلہ دیش کے اُس زمانہ کے صدر نے اپنی پہلی تقریر میں یہی کہا تھا کہ آج کا دن اس لئے مستحقِ مبارکباد ہے کہ اس سے دو قومی نظریہ کا ابطال ہو گیا ہے۔ ویسے تو دو قومی نظریہ قرآن کی ایک ابدی صداقت ہے جو کسی قسم کی شکست سے ناکام ثابت نہیں ہو جاتی۔ لیکن جس نقطۂ خیال سے انہوں نے یہ اعلان کیا تھا اُس کی رُو سے تو ہم پچیس سال سے مسلسل اس کا ابطال خود کرتے چلے آ رہے ہیں اور زیرِ نظر مسودۂ آئین میں اسی کو پھر دُہرایا گیا ہے۔ اس میں سوائے صدر اور وزیرِ اعظم کی تخصیص کے اور کہیں بھی مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں کی گئی۔ ان سب کو ایک ہی قوم شمار کیا گیا ہے۔ اگر اس مسودہ کو اسی طرح ہمارے ملک کا آئین بننا ہے تو ہم گزارش کریں گے کہ اس کے بعد کم از کم دو قومی نظریہ کے الفاظ تو زبان پر نہیں لانے چاہئیں۔ یہ منافقت ہوگی جسے کہیں بھی بنظرِ استحسان نہیں دیکھا جاتا۔

قرارداد مقاصد

مسودہ کی تمہید کا آغاز اُسی قراردادِ مقاصد سے ہوتا ہے جو ۱۹۴۹ء میں پاس کی گئی تھی اور جسے ہر دستور میں بلا سوچے سمجھے اس طرح داخل کر دیا جاتا رہا جس طرح مکتوبات کے اوپر بات سوچے ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے۔ ہم اُسی زمانے سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ قرارداد ایک حد تک بے معنی ہے اور بڑی حد تک تضادات کا مجموعہ۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے:-

> تمام کائنات پر اقتدارِ اعلیٰ (ساورنٹی) صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور اس نے جو اختیارات ملتِ پاکستانیہ کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو تفویض (DELEGATE) کئے ہیں وہ ایک مقدس امانت ہیں جنہیں خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر استعمال کیا جائے گا۔

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ قوم کے نمائندے پاکستان کے لئے جو ایک (SOVEREIGN STATE) ہے آئین مرتب کریں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جملہ کائنات کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اُس نے اپنے اقتدارِ مطلق کی رُو سے وہ قوانین نافذ کئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہِ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن جن معانی میں سیاسی طور پر ایک مملکت ذی اقتدار (SOVEREIGN) ہوتی ہے، خدا کے اقتدارِ مطلق کا تصور اُس سے الگ ہے اور اگر کائنات میں خدا کا اقتدارِ مطلق انہی معانی میں ہے تو پھر اس کائنات میں کوئی مملکت بھی (SOVEREIGN) نہیں ہو سکتی۔

کیونکہ ایک مملکت میں ایک سے زیادہ (SOVEREIGN STATES) کا وجود ناممکنات میں سے ہے۔

اس میں دوسری بنیادی غلطی یہ ہے کہ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ کوئی اتھارٹی جب اپنے اختیارات کسی دوسری اتھارٹی کو تفویض کر دیتی ہے تو جب تک وہ اُن اختیارات کو واپس نہ لے یعنی اُس وقت تک وہ خود اُن اختیارات سے محروم رہتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہ کسی وقت بھی اپنے اختیارات سے محروم رہ جاتا ہے دہریت ہے۔ صحیح پوزیشن یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے ۔۔۔ نہ کسی فرد کی، نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور ادارہ کی ۔۔۔ خدا کی اِس اطاعت کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآن مجید) کی اطاعت ہے جس کے احکام و اصول مسلمانوں کی آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی مملکت ان غیر متبدل حدود و قیود کے اندر رہتی ہوئی سیاسی اعتبار سے (SOVEREIGN) ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت کا مقصد اور فریضہ احکام و اقدار خداوندی کا نافذ اور جاری کرنا ہوتا ہے۔ یہی اس کی وجہ جواز اور مقصد قیام ہوتا ہے۔

مملکت کا مذہب

زیرِ نظر مسودہ میں ایک "بدعت" نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں کہا گیا ہے۔

"مملکتِ پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا"

ہم پوچھنا چاہتے ہیں واضعینِ آئین سے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس شق کا مفہوم کیا ہے۔ مذہب کسی فرد کا ہوتا ہے یا ہم مذہب افراد کے مجموعہ پر مشتمل کسی جماعت یا قوم کا۔ مملکت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے یا غیر اسلامی لیکن مملکت نہ مسلمان ہو سکتی ہے، نہ ہندو نہ عیسائی۔ اگر کسی مملکت میں خالص اسلامی اصول و احکام ہی نافذ ہوں تو بھی اُس مملکت کو اسلامی مملکت تو کہا جائے گا لیکن یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس مملکت کا مذہب اسلام ہے۔ پھر جس مملکت میں مسلم اور غیر مسلم دونوں بستے ہوں اور دونوں کو ایک قوم قرار دیا جائے اُس مملکت کا ایک مذہب کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو اسلامی بھی نہیں کہلا سکتی۔

قرآن و سنّت

سابقہ روش کے تتبع میں اس مسودہ میں بھی کہا گیا ہے کہ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو "قرآن و سنت" کے خلاف ہو اور موجودہ قوانین کو بھی قرآن و سنت کے مطابق وضع کیا جائے گا۔

جیسا کہ ان صفحات پر متعدد بار واضح کیا جا چکا ہے مودودی صاحب نے بالفاظِ صریح کہا ہے کہ "قرآن و سنت" کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر قابل قبول ہو۔ آئین کمیٹی کے ارکان میں جماعتِ اسلامی کے نمائندہ پروفیسر غفور احمد صاحب بھی شامل تھے اور انہوں نے اس شق کے خلاف کوئی اختلافی نوٹ بھی نہیں لکھا۔ ہم پروفیسر صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ مودودی صاحب کے اس دعویٰ کو صحیح سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اگر صحیح سمجھتے ہیں تو انہوں نے اس شق پر صاد کس طرح سے کر دیا۔ اور اگر وہ اسے صحیح نہیں سمجھتے تو کیا وہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ قرآن و سنت کی رُو سے ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکتا ہے جو

تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو ۔ !

اور یہی سوال ہم مُلک کے تمام علمائے کرام سے کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اُن میں سے کوئی ایک یا اُن کی جماعت قرآن و سنت کی رُو سے ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر سکتی ہے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں ؟ اگر کوئی اس کا مدعی ہے تو وہ جرأت کرکے اس کا اعلان کردے، اور اگر ایسا نہیں تو پھر ہم ان حضرات سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ قوم، ملک، مملکت بلکہ ساری دنیا کو کیوں دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان میں ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو جائے گا۔

اس شق میں ایک بنیادی نقص یہ بھی ہے کہ سارے آئین میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ کون سی اتھارٹی ہے جو اس کا فیصلہ کرے گی کہ فلاں قانون کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہمارے نزدیک ملک کے ہر مسلم باشندے کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اختلاف کی صورت میں یہ سوال کسی عدالت کے سامنے پیش کرسکے اور سپریم کورٹ ایسا فیصلہ دینے کی مجاز ہونی چاہیئے۔ اس کے بغیر یہ شق بے معنی ہی نہیں بلکہ نزاعات و اختلافات کا کوہِ آتش فشاں بن کر رہ جائیگی۔

اسلامک کونسل

آئین میں تجویز کیا گیا ہے کہ ایک کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی متعین کی جائے گی جو حکومت کو مشورہ دے گی، کہ فلاں قانون کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں؛ اور موجودہ قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق ڈھلنے کی سفارش کریگی۔ یہ کونسل موجودہ اسلامک ایڈوائزری کونسل کی جگہ لے گی۔ فرق صرف نام کا ہے اختیارات اس کے بھی کچھ نہیں ہوں گے۔ یہ کونسل کیا کارہائے نمایاں سرانجام دے گی اس کا اندازہ موجودہ کونسل کے کارناموں سے لگ سکتا ہے۔

موجودہ کونسل کے سفید ہاتھی کے ساتھ اس کا ایک "بچھڑا" بھی بندھا ہوا ہے جسے اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کہا جاتا ہے۔ موجودہ آئین میں اس کا ذکر نہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غریب قوم کم از کم اس حد تک ان لاحاصل اخراجات کے بوجھ سے بچ جائے گی۔

مجوزہ کونسل کے اراکین کا تقرر تو صدرِ مملکت کے احکام کی رُو سے ہوگا لیکن اس میں یہ شق بڑی دلچسپ ہے کہ اگر اراکین کی اکثریت کسی ممبر کی برطرفی کا ریزولیوشن پاس کردے گی تو صدرِ مملکت اُسے علیحدہ کرسکیں گے۔ یعنی کونسل کا ہر ممبر اپنی عافیت اسی میں سمجھے گا کہ وہ اکثریت کا ساتھ دے۔ اراکین کی حریتِ فکر کا یہیں سے گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔

مسودہ میں اسلام کے متعلق یہی اہم شقیں تھیں۔ اب ہم عام شقوں کی طرف آتے ہیں۔

(۲)

(۱) سوشل جسٹس

آئین کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ پاکستان ایک ایسی جمہوری مملکت ہوگی جو اسلام کے معاشرتی عدل (سوشل جسٹس) کے اصولوں پر مبنی ہوگی غنیمت ہے کہ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ

قائدِ اعظمؒ نے اسلام کا معاشرتی عدل کہا تھا۔ اسلامک سوشلزم نہیں کہا تھا۔

(۲) مشرقی پاکستان

تمہید میں کہا گیا ہے کہ اس آئین کا اطلاق بلوچستان، سرحد، پنجاب اور سندھ کے صوبوں پر ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ جب مشرقی پاکستان کے صوبہ سے غیر ملکی تسلط کے اثرات مٹ جائینگے تو آئین میں ایسی تبدیلی کر دی جائیگی جس سے اس صوبہ کے باشندوں کو بھی امورِ مملکتِ پاکستان میں مناسب نیابت مل جائے۔

امید ہے کہ اس سے نام نہاد بنگلہ دیش کے تسلیم کئے جانے یا نہ کئے جانے کا وہ غبار چھٹ جائیگا جس نے ہمارے سیاسی مطلع کو اس قدر مکدر کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کو جس قدر بازیچۂ اطفال بنایا گیا، اس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہ تو اسے تسلیم کرنے کے حامیوں نے آج تک یہ بتایا کہ تسلیم کرنے میں کیا فائدے ہیں اور تسلیم نہ کرنے میں کیا نقصان۔ اور نہ ہی اُن کے مخالفین نے کہیں اس کی وضاحت کی کہ ایسے تسلیم کرنے میں کیا نقصانات ہیں اور نہ تسلیم کرنے میں کیا فوائد۔ جہاں اور جب یہ مسئلہ چھڑا، بات گالی گلوچ سے شروع ہوئی اور گریبان اڑا دینے اور خون کی ندیاں بہا دینے پر ختم کر دی گئی۔ امید ہے آئین کی اس شق کے بعد یہ مسئلہ موضوعِ بحث نہیں رہیگا۔ اس میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان بدستور مملکتِ پاکستان کا حصہ ہے جس پر اس وقت خارجی اثرات غالب ہیں۔

(۳) صوبجاتی خودمختاری

آئین کا ڈھانچہ فیڈریشن کا ہے جس میں چاروں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی گئی ہے اور یہی ہمارے نزدیک اس باقی ماندہ حصّہ پاکستان کی تباہی کی تمہید ہے۔ جیسا کہ ہم بار بار کہتے چلے آ رہے ہیں یہاں صوبوں کی حیثیت محض انتظامی خطوں کی سی نہیں سمجھی جا رہی بلکہ سمجھا یہ جا رہا ہے کہ ہر صوبے میں ایک علیحدہ مستقل قوم بستی ہے جسے کامل خودمختاری کا حق حاصل ہے۔ خان عبد الولی خان صاحب تو موجودہ مرکز کو بھی چاروں صوبوں کا مرکز تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر موجودہ آئین منظور بھی کر دیا گیا تو اس کا اطلاق صرف پنجاب اور سندھ پر ہو سکے گا، جہاں پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار ہے۔ سرحد اور بلوچستان پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکے گا۔ (نوائے وقت ۳ جنوری)

اُن کے ساتھ ہی اُن کے والدِ بزرگوار عبد الغفار خان صاحب فرما رہے ہیں کہ پختونستان کی حد دریائے جہلم تک ہوگی۔ وہ پختونوں کو شرم دلا رہے ہیں کہ جو کام مجیب کی قیادت میں بنگالیوں نے چار سال میں سرانجام دے دیا وہ تم لوگوں سے ۲۳ سال میں نہ ہو سکا۔　　(نوائے وقت - ۱۴ جنوری ۷۳ء)

ان حالات میں صوبائی خودمختاری کا اگلا قدم صوبائی علیحدگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ضرورت اس امر کی تھی کہ مغربی پاکستان میں وحدانی حکومت قائم کی جاتی اور صوبائی تفریق کو ختم کر دیا جاتا۔ حیرت ہے کہ مشرقی پاکستان جس کی آبادی یہاں سے بھی زیادہ ہے صوبائی تقسیم کے بغیر وحدانی حکومت قائم کر رہا ہے اور ہم اپنے

سابقہ تلخ ترین تجربہ کے باوجود صوبائی خودمختاری کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

۴۔ صدرِ مملکت

عباسی سلطنت کے زوال کے زمانے میں صورت یہ تھی کہ حکومت کبھی دیلمیوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی، کبھی سلجوقیوں کے، اور عباسی خلیفہ کا نام جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں پڑھے جانے کے لئے باقی رکھ لیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ہمارے مجوزہ آئین میں یہی حیثیت صدرِ مملکت کی رکھی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ

(الف) صدرِ مملکت تمام امور وزیرِ اعظم کی رائے اور مشورے کے مطابق سرانجام دیگا اور اس کی رائے اور مشورے کی پابندی اُس پر لازم ہوگی۔ (آرٹیکل ۵۱)

(ب) صدرِ مملکت کا کوئی حکم قابلِ عمل نہیں ہوگا جب تک اس پر وزیرِ اعظم کے دستخط ثبت نہیں ہوں گے (آرٹیکل ۵۱)

(ج) جب پارلیمان کا منظور کردہ کوئی مسودۂ قانون صدرِ مملکت کے پاس بھیجا جائے گا تو صدر کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ سات دن کے اندر اندر اس کی توثیق کر دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ مسودۂ قانون خودبخود منظور شدہ قرار پا جائے گا۔ (آرٹیکل ۵۷)

(د) وزیرِ اعظم کے مشورہ کے دو دن کے اندر اندر صدر کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ قومی اسمبلی کو توڑ دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریگا تو وزیرِ اعظم خود بنام صدر اسمبلی کو توڑ دیگا۔ (آرٹیکل - ۷۱)

یہی پوزیشن صوبوں کے گورنروں کی بھی ہوگی۔

(۵) وزیرِ اعظم

مرکز کے جملہ اختیارات وزیرِ اعظم کے ہاتھ میں ہونگے اور صوبوں کے اختیارات وزرائے اعلیٰ کے ہاتھ میں۔ وزیرِ اعظم کا انتخاب تو سادہ اکثریت سے ہوگا لیکن اسے برطرف کرنے کے لئے پندرہ سال تک دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوگی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسمبلی کو توڑ دینے کا اختیار وزیرِ اعظم کے ہاتھ میں ہوگا لیکن اسمبلی کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی وزیرِ اعظم اور اس کی کابینہ بدستور برسرِ اقتدار رہے گی۔ (آرٹیکل ۹۷)

اسمبلی کو اختیار ہوگا کہ وہ وزیرِ اعظم کے خلاف عدمِ اعتماد کا ریزولیوشن پیش کر سکے لیکن وزیرِ اعظم کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ اس ریزولیوشن کے پاس ہونے سے پہلے اسمبلی کو توڑ دے۔ (آرٹیکل ۹۹)

یہی پوزیشن صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کی بھی ہوگی۔

مسودہ قانون کے اسمبلی میں پیش ہونے کے ساتھ ہی حزبِ اختلاف کے نمائندگان کی طرف سے ان شقوں کے خلاف کہرام مچا دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ جمہوریت نہیں خالص ڈکٹیٹر شپ ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ مسودہ مہینوں سے زیرِ تسوید چلا آ رہا تھا۔ ان جماعتوں کے نمائندے آئین کمیٹی کے اندر موجود تھے۔ جب وہ دیکھ رہے تھے کہ آئین میں اس قسم کی شقیں رکھی جا رہی ہیں تو وہ اس وقت کیا کرتے رہے۔ ان کے خلاف احتجاج کے طور پر

استعفیٰ تو صرف ایک رکن — میاں محمود علی قصوری صاحب — نے دیا۔ باقیوں کی طرف سے تو احتجاج کا لفظ تک بھی سنائی نہیں دیا۔ دوسری طرف حزبِ اقتدار کا یہ کہنا ہے کہ یہ شقیں خود حزبِ مخالف کے نمائندوں کے ایماء پر رکھی گئی تھیں۔ ان حالات میں قوم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہے کہ

بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے میرؔ عشق میں
دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ اس کشمکش میں ملک کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

(۶) مغربی جمہوریت

ہمارے نزدیک چونکہ مغربی جمہوریت کا یہ سارا نظام ہی غیر اسلامی ہے۔ اس لئے ہم اس پر کوئی تبصرہ بے کار سمجھتے ہیں۔ اسلامی نظام شورائیت میں تمام اختیارات و اقتدارات قرآن کریم کی مقرر کی ہوئی حدود و قیود و شرائط کے پابند ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں کسی کے کسی دوسرے پر مسلط ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب اقبالؒ کے الفاظ میں سیاست دین سے الگ ہو جاتی ہے، تو اس کا نتیجہ چنگیزیت کے سوا کچھ نہیں ہوتا خواہ فریب خوردگی یا فریب دہی کے لئے آپ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیں۔ جہاں تک منتخب کردہ حکومت کے بدلنے کا تعلق ہے، اسلامی نظام میں صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر خلیفہ کے خلاف ایک اعتراض بھی کر دیا جائے تو وہ منبر سے نیچے اتر کر اس کا جواب دیتا ہے اور پھر اقتدار کی مسند پر قدم نہیں رکھتا جب تک امت اس کے جواب کو قابلِ اطمینان قرار دے دے۔ اس میں ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت ان سے کہا گیا کہ وہ خلافت کے لئے نامزدگان کی فہرست میں اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کا نام بھی شامل کر دیں۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر عمرؓ ہی اپنی ذمہ داریوں کی بازپرس سے چھٹکارا حاصل کر لے تو از بس غنیمت ہوگا۔ تم لوگ خاندانِ خطاب کو بارِ دیگر مواخذے کے کٹہرے میں کیوں لانا چاہتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ذمہ داری کے اس احساس کے ماتحت نہ کسی کو دوسروں کی گردن پر پاؤں رکھ کر اقتدار حاصل کرنے کی ہوس ہوتی تھی، نہ دوسروں کو صاحبِ اقتدار کی گردن مروڑ کر اسے الگ کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی — اس قسم کے پھل مغربی جمہوریت کے شجرۃ الزقوم کا فطری نتیجہ ہیں۔

(۷) بنیادی حقوق

مسودۂ آئین میں حسبِ سابق بنیادی حقوق کی لمبی چوڑی فہرست دی گئی ہے لیکن انداز اس کا بھی یہی ہے کہ — اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے — کسی حق کو بھی آپ نہ بطورِ حق کے طلب کر سکتے ہیں، نہ اس کے نہ ملنے پر کوئی چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔ جب تک ان حقوق کے متعلق یہ شق موجود نہ ہو کہ ان کے نہ ملنے پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکتا ہے، ان کی فہرست بالکل بے معنی رہ جاتی ہے۔

(۸) ماسلف پر مواخذہ

عدل کا یہ ایک بنیادی مسلمہ ہے کہ کسی شخص کو کسی ایسے فعل کے ارتکاب کی سزا نہیں دی جا سکتی جسے، اس کے

ارتکاب کے وقت، رائج قانون کی رُو سے جرم قرار دیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قانون کو کسی سابقہ تاریخ سے نافذ العمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مسلّمہ مسودہ آئین کے آرٹیکل ۱۲ میں بھی درج ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ دستورِ پاکستان کو معطل یا منسوخ کرنے کے فعل کو ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے ایسا جرم قرار دیا جائے گا جس کی سزا موت تک ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں باتیں باہمدگر متضاد ہیں۔ خود قرآنِ کریم میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ کسی قانون کے نافذ ہونے سے پہلے کے افعال کو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۹۔ تفتیش میں تشدّد

مسودہ آئین کے آرٹیکل ۱۳ میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص پر تشدّد کر کے اُس سے شہادت نہیں اگلوائی جائیگی۔ یہ شق بھی عدل کا بنیادی تقاضا ہے۔ خود قرآنِ کریم کی رُو سے بھی کسی ملزم کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جا سکتی تاوقتیکہ وہ جرم ثابت نہ ہو جائے لیکن آج ہمارے ملک میں ہی نہیں ساری دنیا میں ملزموں پر جس قسم کا تشدّد کیا جاتا ہے، وہ اُس سزا سے بھی کہیں زیادہ اذیت رساں ہوتا ہے جو اُن کے جرم ثابت ہونے کے بعد انہیں دی جاتی ہے۔ اور ملزموں میں سے کم و بیش پچھتّر فیصد، اس تشدّد کے بعد بے گناہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ وہ نظامِ تفتیش ہے جو کسی نہ کسی شکل میں ساری دنیا میں رائج ہے۔ ہر اجرائیہ اس سے واقف ہے، ہر عدالت کو اس کا علم ہوتا ہے لیکن اس قدر کھلے ہوئے ظلم کو ختم کرنے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عدل اور قانون کے متعلق اس قدر چرچا کے باوجود، بے گناہوں پر اس قسم کا لرزہ انگیز ظلم اور تشدّد ہر عام روا رکھا جاتا ہے جس شق کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس قسم کی شق دنیا کے ہر آئین میں موجود ہوتی ہے لیکن اس کا اندراج محض تبرکاً ہوتا ہے ــــــ کیا پاکستان میں اس پر عمل ہوگا؟

پرایئویٹ پراپرٹی کا تحفظ

بنیادی حقوق میں پرائیویٹ پراپرٹی کے تحفظ کی بھی ضمانت دی گئی ہے لیکن یہ ضمانت مشروط ہے چند شرائط کے ساتھ اور اس میں کچھ مستثنیات بھی رکھی گئی ہیں۔ ایک استثنائی صورت یہ ہے کہ رفاہِ عامہ کی بعض شکلوں کے لئے ــــ مثلاً طبّی امداد یا تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں حکومت کسی کی پرائیویٹ پراپرٹی کو بلامعاوضہ حاصل کر سکتی ہے۔

جیسا کہ ہم برسوں سے لکھتے چلے آ رہے ہیں قرآنی نظام میں ذاتی جائیداد کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں تمام دولت اور ذرائع پیداوارِ ملت کی اجتماعی تحویل میں رہتے ہیں لیکن وہ نظام سب سے پہلے تمام افرادِ مملکت کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ اُن کی اور ان کے اہل و عیال کی ضروریاتِ زندگی کا ذمہ دار ہے۔ اس ضمانت کے بعد کسی کو ذاتی املاک کی ضرورت ہی نہیں پڑتی لیکن جہاں کوئی نظام اس قسم کی ذمہ داری کی ضمانت نہ دے اور افرادِ مملکت اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات پورا کرنے کے آپ ذمہ دار ہوں، اُن سے بلامعاوضہ املاک چھین لینا جائز قرار نہیں پا سکتا۔ ہمارے ہاں تو خیر ابھی نظام ہی سرمایہ دارانہ ہے۔ افرادِ مملکت کی ضروریات بہم پہنچانے کی ضمانت تو وہ حکومتیں بھی نہیں دے سکیں جہاں سوشلزم کا معاشی نظام رائج ہے۔ بنا بریں، آپ آئندہ کے لئے

از روئے قانون ذاتی املاک کی حد بندی کر سکتے ہیں لیکن جس زمانے میں کوئی ایسا قانون رائج نہیں تھا اُس زمانے کی ذاتی املاک کو بلامعاوضہ حاصل کر لینا عدل کے خلاف ہوگا۔ قرآنی نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ جس کے پاس ایدا از ضرورت ہے اُس سے وہ لے کر انہیں دے دیا جائے جن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ لہٰذا، زاید از ضرورت لے لینے سے پہلے اِس دوسری شرط کا پورا کیا جانا ضروری ہے۔ اس صورت میں مملکت میں نہ وہ لوگ بھوکے رہتے ہیں جن سے زاید از ضرورت لے لیا جاتا ہے اور نہ وہ بھوکا رہتا ہے جس کے پاس اپنی بھوک ختم کرنے کے لئے سامانِ زیست نہیں ہوتا۔ یہ ہے معیارِ عدل قرآنی نظام کی رُو سے —! افسوس ہے کہ اس راز کو نہ مُلّا سمجھتا ہے، نہ کوئی ترقی پسند ریفارمر — وہ کسی صورت میں بھی "چھین لینے" کو جائز قرار نہیں دیتا اور یہ بلاشرط و ضمانت چھین لینے کو حق بجانب سمجھتا ہے — قرآن اغنیاء سے لیتا ہے تاکہ محتاجوں کی ضروریات پوری ہو سکیں —! اور مومن تو اس مقصد کے لئے اپنا سب کچھ از خود ملت کے حوالے کر دیتا ہے۔

(۱۱) ترحمِ خسروانہ

حسبِ معمول اِس مسودہ آئین میں بھی صدرِ مملکت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی مجرم کی اُس سزا میں جو اُسے کسی عدالت کی طرف سے از روئے قانون دی گئی ہو کمی بیشی کر سکتا ہے اور اُسے یکسر معاف بھی۔

عدل اور رحم کے تضاد کا تصور بڑی پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے لیکن قرآن اِس مسئلے کو بآسانی حل کر دیتا ہے۔ وہ قانون سے باہر کسی اتھارٹی کو رحم کا اختیار نہیں دیتا بلکہ خود قانون کے اندر ایسی شق رکھ دیتا ہے کہ خصوصی حالات میں مجرم کے ساتھ نرمی برتی جائے یا اُسے معاف ہی کر دیا جائے۔ جب اس قسم کی گنجائش خود قانون کے اندر رکھ دی جائے تو یہ اختیار بھی خود عدالت کو حاصل ہوگا کہ وہ اثباتِ جرم کے بعد بھی خصوصی حالات میں مجرم سے رعایت برتے۔ یوں عدل اور رحم ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے۔ لیکن اگر عدل اور قانون بلا لچک ہو اور اس کے بعد کسی اور اتھارٹی کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ عدل اور قانون کے تقاضوں سے بالا ہو کر اپنے خصوصی اختیارات کے ماتحت ترحمِ خسروانہ سے کام لے تو پھر عدل اور رحم میں تصادم ہو جائے گا۔ ہمارے نزدیک خود قانون میں اس قسم کی گنجائش رکھی جانی چاہیئے تاکہ خود عدل کرنے والی اتھارٹی اس گنجائش کی رُو سے رحم بھی کر سکے۔

(۱۲) ملازمین حکومت

زیرِ نظر مسودہ آئین میں ملازمین حکومت کے حقوق کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی۔ اس قسم کی آئینی ضمانت اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر عمالِ حکومت کبھی دلجمعی سے اپنے فرائض سرانجام نہیں دے سکتے جب کارکنانِ حکومت اپنے مستقبل کو محفوظ نہ سمجھیں تو پھر نظم و نسقِ حکومت کی مشینری کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔

حرفِ آخر

ظاہر ہے کہ اس آئین کو کسی صورت میں بھی معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جو بات اس میں

بنیادی طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے، وہ عبرت انگیز بھی ہے اور پریشان کن بھی۔ اس وقت پارلیمان میں پیپلز پارٹی کی خاصی اکثریت ہے۔ اس قسم کی اکثریت رکھنے والی پارٹی اپنا کاروبار بنہایت اطمینان سے سادہ اکثریت (۵۱ فیصد) کے قاعدے کے مطابق سرانجام دے سکتی ہے لیکن مجوزہ آئین میں پارٹی کے ذی اقتدار رہنے کے لئے جو خصوصی تحفظات رکھے گئے ہیں وہ اس امر کے غماز ہیں کہ اس پارٹی کو خود اپنے اراکین پر بھی کلی اعتماد نہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ حزب مخالف اس قدر شور مچا رہا ہے۔ اگرچہ حزبِ اقتدار کا کہنا ہے کہ یہ شق خود حزب مخالف کے ایما پر مسودہ میں داخل کی گئی ہے ـــ ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

ہمارے نزدیک اس وقت بنیادی مسئلہ کسی معیاری آئین کا نہیں بلکہ خود مملکتِ پاکستان کے مستقبل کا ہے۔ حزب مخالف کی بیشتر جماعتیں وہ ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی اور وہ اسے اب تک دل سے تسلیم نہیں کر پائیں۔ ان کا مقصد اس بچے کھچے حصۂ ملک کو بھی ختم کر دینا ہے۔ ان کے پاس کوئی تعمیری پروگرام نہیں۔ برسرِ اقتدار پارٹی کی طرف سے جو غلطیاں مسلسل سرزد ہوتی چلی آ رہی ہیں اور ہو رہی ہیں، یہ صرف اُن سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انہی غلطیوں کی وجہ سے یہ پارٹی اب ملک میں ایسی پاپولر نہیں رہی جیسی سنہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے زمانے میں تھی۔ اگر انہوں نے اپنی روش نہ بدلی تو مخالف پارٹیوں کی سرگرمیاں اسی نسبت سے تیز تر ہوتی جائیں گی اور اس کا جو انجام ہوگا، اس کے تصور سے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اس سے ملک کو جو بھی نقصان پہنچا، اُس کی بالواسطہ ذمہ داری برسرِ اقتدار پارٹی کے سر پر عائد ہوگی۔ خدا کرے کہ یہ بنیادی نقطہ اس پارٹی کی سمجھ میں آ جائے۔ اسی سے یہ مملکت سنبھل سکتی ہے۔

ہم جب اپنی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اس بحران سے یہاں کوئی ایسی قدآور شخصیت پیدا ہوگی جو پاکستانی مسلمانوں کو اسلام کی بنیادوں پر اسی طرح پھر سے ایک قوم کے قالب میں ڈھال سکے گی جس طرح قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران کیا تھا۔ اس مملکت کو صرف "ایک مسلم قوم" کا تصور ہی بچا سکتا ہے اور اس کے لئے ایک قدآور شخصیت کی ضرورت ہے جو آج ملک میں موجود نہیں۔ واضح رہے کہ ایسی شخصیت قوم کے اندر ہی سے پیدا ہوگی، آسمان سے نہیں اترے گی۔ جب قرآنی اصولوں کے مطابق یہ قوم امتِ واحدہ ہوگی تو اس میں نہ مذہبی فرقے ہونگے نہ سیاسی پارٹیاں، نہ حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف کا وجود ہوگا کہ ان کی باہمی رسّہ کشی ہو۔ اُس وقت حکومت ساری امت کی مشترکہ ہوگی جس کا کاروبار باہمی مشاورت سے طے پائے گا۔ وذالک دین القیم۔

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درس قرآن مجید

ہر اتوار، بوقت: ۹½ بجے صبح

بمقام: ۲۵/بی، گلبرگ ۲۔ لاہور میں ہوتا ہے

نوٹ: عورتوں کے لئے پردہ کا انتظام بھی ہوتا ہے۔

محترم وزیرِ تعلیم (پنجاب) کی وضاحت

ذیل کی خط و کتابت کسی وضاحت کی محتاج نہیں!

---

(۱)

محترم جناب پرویز صاحب۔ سلام مسنون۔

آپ کا استقبالیہ خطبہ بعنوان "معرکۂ دین و وطن" جو "طلوع اسلام کنونشن" منعقدہ نومبر ۱۹۷۲ء میں پڑھا گیا، میری نظر سے گزرا۔ آپ نے روزنامہ نوائے وقت، اشاعت ۲۷ جون ۱۹۷۲ء کی ایک خبر کو دستاویز بنا کر مجھے بھی اُن حضرات کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جو پاکستان کے دشمن اور اسلام کے نظریۂ حیات ہونے کے منکر ہیں۔ افسوس کہ آپ نے نوائے وقت ہی کی اگلے روز کی اشاعت یعنی ۲۸ جون ۱۹۷۲ء کا پرچہ نہیں پڑھا جس کے عقبی صفحے کی پیشانی پر نمایاں طور پر ایک چوکھٹے میں "وزیر تعلیم کی وضاحت" کے عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی ہے وہ خبر من و عن آپ کے استفادہ کے لئے نقل کر رہا ہوں:۔

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۲۸ جون ۱۹۷۲ء

وزیر تعلیم کی وضاحت

۲۷ جون (چیف رپورٹر) پنجاب کے وزیر تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق نے آج اسمبلی میں وضاحت کی کہ قائداعظمؒ کا پاکستان بنانے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب، اسلامی ثقافت اور رسم و رواج کا تحفظ ہو سکے اور ساتھ ہی مسلمانوں کے معاشی استحصال کا خاتمہ کیا جا سکے۔ یاد رہے کہ آج نوائے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر کی سرخی یہ تھی ـــ "اسلام قائداعظمؒ کے پاکستان کی اساس نہیں تھا"۔ انہوں نے وضاحتی بیان میں مزید کہا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم تعلیم کو صرف روزی کمانے کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ طلبا کو سائنسی اور فنی تعلیم دی جائے تاکہ ملازمت نہ ملے تو اپنی روزی کما سکیں۔"

اگرچہ اس وضاحت کے بعد میری طرف سے مزید وضاحت کی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم میں یہ کہوں گا کہ معاش و معاد میں اعتدال ہی سے ہم ایک اچھا اسلامی معاشرہ پیدا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے آپ اتفاق کریں گے کہ محض معاد کی فکر میں حقوق العباد سے آنکھیں پھیر لینا بھی درست نہیں اور معاش کی دوڑ میں معاد سے روگردانی بھی ٹھیک نہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں اپنے خطبہ میں اور تالیفات میں بھی میرے بارے میں غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں گے۔

آپ کا مخلص۔ (عبدالخالق)

وزیر تعلیم (پنجاب)، لاہور۔ مورخہ ۸/۱

---

(۲) محترمی ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۷۳ء ما جرا نواز ہوا۔ یاد فرمائی کے لئے شکر گذار ہوں۔ میرے تبصرہ کی بنیاد 'نوائے وقت' بابت ۲۷ جون ۱۹۷۲ء میں شائع شدہ رپورٹ تھی۔ آپ نے اچھا کیا جو اپنی وضاحت سے مجھے مطلع فرما دیا۔ میرا خطاب بعنوان 'معرکۂ دین و وطن'، ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی وضاحت

بھی اُسی کو (ماہنامہ) میں شائع کر دی جائے۔ چنانچہ میں آپ کا مکتوب گرامی اپنے اس جواب کے ساتھ اُس پرچہ میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔

۲۔ ضمناً عرض خدمت ہے کہ قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے معاش اور معاد (دنیا اور آخرت) میں خطِ تفریق نہیں کھینچا جا سکتا۔ جب کسی معاشرہ میں قرآنی نظام متشکل ہو تو اس میں معاش اور معاد دونوں کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں ۔۔۔ مملکتِ پاکستان کو اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔

امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ والسلام!

خیر طلب

پرویز

بشرفِ نظر: محترم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب

وزیر تعلیم (پنجاب)، لاہور

غیر مستطیع حضرات کے لئے ایک خصوصی پیشکش

ہمارے پاس اکثر ایسے احباب کے خطوط آتے رہتے ہیں جو ماہنامہ طلوعِ اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اُن میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ دس روپے چندہ ادا کر سکیں ۔ قرآنی فکر سے وابستہ ایک مخیر دوست نے یہ پیشکش کی ہے کہ اگر ایسے غیر مستطیع شائقین نصف چندہ (یعنی پانچ روپے) ادا کر دیں تو وہ بقایا پانچ روپے اپنی طرف سے ادا کر دیں گے اور یوں اُن کے نام سال بھر کے لئے طلوعِ اسلام جاری ہو جائے گا۔

۔۔ سرکاری اور دینی درس گاہوں کے طلباء، نیز ائمہ مساجد و اساتذہ حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے والے حضرات پانچ روپے بذریعہ منی آرڈر ہمیں بھیج دیں۔ رسالہ اُن کے نام سال بھر کے لئے جاری کر دیا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

ضرورتِ رشتہ

ایک شریف النسب تعلیم یافتہ دوشیزہ کے لئے جو ایک اسکول میں ہیڈ مسٹرس ہے۔ اور ماہانہ تنخواہ -/۵۰۰ روپے ہے۔ نیز اپنا رہائشی مکان بھی ہے، موزوں رشتہ درکار ہے۔ ذات پات کی تمیز نہیں۔ شرافت، روزگار اور قرآنی زاویۂ نگاہ کی ضرورت ہے۔

خط و کتابت کا پتہ

(م ۔ س) معرفت ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ لاہور

نقد و نظر

"جدید عالمِ اسلام" ۔۔۔ مؤلفہ صلاح الدین ناسک، شائع کردہ۔ عزیز بک ڈپو۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور
ضخامت ۔۔ قریب ۵۰۰ صفحات۔ کتابت، طباعت، کاغذ:۔ عمدہ۔　　　　قیمت:۔ پندرہ روپے ۱۵/-

جناب ناسک کی دو کتابوں پر تبصرہ اس سے پہلے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ اُن کی یہ تیسری کتاب بھی انہی خصوصیات کی حامل ہے۔ جسے عالمِ اسلام کہا جاتا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ آدھی دنیا پر پھیلا ہوا ہے اور اُس کا تذکرہ بھی اکثر ہماری زبانوں پر رہتا ہے لیکن اُس کے متعلق ہماری معلومات عام طور پر بڑی سطحی اور بیشتر سُنیدہ پر مبنی ہوتی ہیں۔

محترم مؤلف نے زیرِ نظر کتاب میں مسلمانوں کی ان مملکتوں کے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچا دی ہیں ۔۔۔ ترکی، مصر، ایران، سعودی عرب، شام، اردن، عراق ۔۔۔ ان ممالک کے متعلق عام معلومات اور تاریخی پس منظر کے بعد اُن کے موجودہ احوال و کوائف، ان کی طرزِ حکومت، وسائلِ پیداوار، داخلی اور خارجی سیاست وغیرہ کے متعلق ایسی بحث کی گئی ہے جس سے اُن کا تفصیلی نقشہ ذہن میں مرتسم ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کا مقدمہ بھی سابقہ دو کتابوں کی طرح مترجم کے تخلیل کی وسعتِ نظر اور جولانیٔ قلم کا رہینِ منت ہے۔ اُن کے بیان کردہ تاریخی پس منظر میں تو کہیں کہیں اعتراض کی گنجائش ہے لیکن اُن کی تشخیص سے کسی صاحبِ فکر کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

> قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس میں حیاتِ اجتماعی اور انفرادی کا کوئی پہلو تشنۂ قانون نہیں۔ اس کا اگر ایک جزو بھی ہمارے ایمان و عمل کے دائرے سے خارج ہو جائے تو کئی متعلقہ کڑیاں متزلزل و متأثر ہوتی ہیں اور خود اس کڑی کے فقدان سے پیدا ہونے والا خلاء اور شگاف بھی کسی دوسری چیز سے پُر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جزوی تعمیل کی صورت میں نتائج کے مفید مقصد نہ ہونے کی ذمہ داری خدا کی نہیں رہتی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد ہم نے قرآن سے بطور ضابطۂ حیات اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا، یا اُسے منقطع کر دیا گیا تھا۔ اب ہم نے اپنی سحر کے ڈانڈے خلافتِ راشدہ کی شام سے ملائے ہیں تاکہ تجدیدِ سفر کی سمت درست ہو۔ لیکن سحر منتشر فکروں کی نہیں ہوتی پورے افق کی ہوتی ہے۔

اس کا علاج انہوں نے بتایا ہے ۔۔۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً۔

اطاعت و تسلیم میں جہاں تک پہنچ سکتے ہو پہنچ جاؤ۔

اطاعت و تسلیم کو بحیثیت کل کے اختیار کر لو۔

اطاعت و تسلیم کی وادیوں میں بحیثیت ایک جماعت قدم رکھو۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کے نظام کو کلی حیثیت سے اختیار کیا جائے۔ صرف کسی ایک معاشرے یا مملکت میں نہیں بلکہ پورے کے پورے عالمِ اسلام میں ۔۔ اسی سے مسلمان اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا سکتا ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں محتاج
بہار ہو کہ خزاں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

کیا اِسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے

یا

یہ آج بھی اپنے زمانے کی امامت کر سکتا ہے

طلوعِ اِسلام کنونیشن منعقدہ۔ نومبر ۱۹۷۲ء میں

پرویز صاحب کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے

صدر محترم و عزیزانِ گرامی قدر! اسلام و رحمت۔

ایک بات کچھ عرصہ سے میرے مشاہدہ میں آ رہی تھی۔ اب اس نے کافی شدت اختیار کر لی تو میں نے ضروری سمجھا کہ اسے اپنی خلوت کی تنہائیوں سے نکال کر آپ احباب کی جلوت گاہ میں لے آؤں۔ کنونشن کا یہ اجلاس اس کے لئے مناسب ترین موقعہ سمجھا گیا۔ میرے ہاں مغربی ممالک کے دانشور، وہاں کے مختلف علمی اور فکری اداروں کے ریسرچ سکالرز، یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلباء اسلام کے متعلق کچھ دریافت کرنے اور سمجھنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق انہیں اسلام کے بنیادی اصول سمجھاتا ہوں تو وہ نہ صرف ان سے متفق ہوتے ہیں بلکہ اکثر ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ لیکن آخر میں وہ ایک سوال کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر اسلام ایسا ہی انسانیت ساز اور منفعت بخش نظامِ حیات تھا تو وہ تھوڑا سا عرصہ قائم رہنے کے بعد ناکام کیوں ہو گیا۔ وہ آگے کیوں نہ چلا؟ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ یہی خیال ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی عام ہو رہا ہے اور میرا اندازہ یہ ہے کہ اسے ایک خاص مقصد کے تحت منظم طور پر پھیلایا جا رہا ہے۔ مغربی مفکر اپنے خیال کا اظہار کچھ نرم انداز سے کرتے ہیں لیکن ہمارے یہ نوجوان بڑی جرأت و بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے تاریخ کے ایک خاص دور میں اس قسم کے درخشندہ نتائج پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن اس کے بعد زمانہ آگے بڑھ گیا حالات بدل گئے۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اب اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا ہمیں اس خوش فہمی سے نکل جانا چاہیئے کہ ہم اسلام کو ساتھ رکھتے ہوئے زندہ رہ سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ ہیں وہ خیالات جن کا اظہار ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے بہ شد و مد کیا جاتا ہے۔ میں اپنے ان نونہالانِ ملت کے اس قسم کے خیالات پر نہ ناک بھوں چڑھایا کرتا ہوں، نہ ہی انہیں لاحول پڑھ کر دھتکارا کرتا۔ میں ان حالات کا جائزہ لیا کرتا ہوں جن کی بنا پر ان کا دل اس قسم کے وساوس کی آماجگاہ اور ان کا دماغ اس قسم کے شکوک کا مسکن بنا دیا جاتا ہے اور کوشش کیا کرتا ہوں کہ حقائق و بصائر کی رو سے انہیں اصل حقیقت سے آگاہ کروں اور دلائل و براہین کی بنیادوں پر ان کے شکوک و شبہات دور کروں۔ اس میں مجھے اکثر کامیابی ہوتی ہے۔ آج کی نشست میں اس خطاب سے بھی میرا مقصود یہی ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس کا عنوان بھی انہی نوجوانوں کے الفاظ سے مستعار لیا ہے۔

اسلام کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ اس کائنات میں خدا کے متعین کردہ غیر متبدل، اٹل قوانین کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عظیم اس حسن وخوبی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ عام اصطلاح میں انہیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین کروڑھا کروڑ سالوں سے اسی طرح کارفرما چلے آرہے ہیں۔ نہ یہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ آج تک کسی مقام پر رک گئے ہیں۔ نہ ہی ان کے نتائج و اثمار میں کسی قسم کا نقص یا خلفشار رونما ہوا ہے۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳) تم تخلیقِ خداوندی میں کہیں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔

جس طرح خدا نے خارجی کائنات کے لئے اٹل قوانین متعین کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کیلئے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار مقرر کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام کو زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور انسانی معاشرہ سکون و اطمینان کا گہوارہ اور عروج وارتقاء کا طیارہ بن جاتا ہے لیکن اشیائے کائنات اور انسانی دنیا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق

انسانی دنیا

زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انہیں ان کی خلاف ورزی کا اختیار ہی نہیں۔ لیکن انسان کو صاحب ارادہ پیدا کیا گیا ہے لہٰذا اسے اس کا اختیار ہے کہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے ان سے سرکشی اختیار کرلے۔ جب کوئی قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی تو وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوگی۔ جب وہ انہیں چھوڑ دے گی تو ذلتوں اور پستیوں کے جہنم میں جا گرے گی۔ اگرچہ بات بالکل واضح ہے لیکن میں دو ایک مثالوں سے اس کی مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ایک مریض کسی ڈاکٹر سے علاج کراتا ہے اور اس کے نسخے سے اسے آرام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اس نسخہ کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور پھر بیمار ہو جاتا ہے۔ فرمائیے! اس سے کیا آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ نسخہ ناکام رہ گیا یا یہ کہیں گے اس مریض نے اس نسخہ کو چھوڑ کر مرض کو پھر بلا لیا؟

یا مثلاً ایک شخص کسی خاص مقام تک جانے کے لئے موٹر میں سوار ہوا۔ راستے میں اس نے موٹر کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ریسٹ ہاؤس میں جا کر سو گیا اور یوں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ نہ سکا۔ کہیئے! آپ اس کے متعلق یہ کہیں گے کہ اس موٹر میں اس کی صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ اگلا راستہ طے کر سکتا یا اس مسافر کی تن آسانی کا ماتم کرینگے!

یا مثلاً ایک شخص چھت پر جانے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھا لیکن نصف سیڑھیوں پر پہنچ کر پہلے بیٹھ گیا اور پھر نیچے اتر آیا۔ فرمائیے! آپ اس پر یہ حکم کریں گے کہ اس مکان کی سیڑھیاں بڑی ناقص ہیں جو کسی کو چھت تک نہیں لے جا سکتیں، یا اس شخص کی دوں ہمتی کو الزام دینگے؟

یا (مثلاً) ہمارے ہاں "بائیں طرف چلو" (KEEP TO THE LEFT) ٹریفک کا قانون ہے۔ گذشتہ ماہ تک ہمارا معاشرہ اس قانون کے مطابق چلتا رہا تو ٹریفک کا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ یکم نومبر سے ہر راہرو یہ کہہ کر

گھر سے نکلا کروں اس قانون کی پابندی نہیں کروں گا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ فرمایئے! کیا آپ اس سے یہ نتیجہ مرتب کریں گے کہ اکتوبر کے آخر تک تو اس قانون میں ٹریفک کے حادثات روکنے کی صلاحیت تھی لیکن اس کے بعد اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ بالکل بیکار ہو گیا ہے! یہ اس قابل ہی نہیں کہ بڑھتی ہوئی ٹریفک کا ساتھ دے سکے۔

ان مثالوں کے بعد عزیزانِ من! پھر اصل موضوع کی طرف آجایئے۔ اسلام نے زندگی کے کچھ اصول و قوانین دیئے۔ ایک قوم نے ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کیا۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کی درخشندگی و تابناکی سے آج بھی تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ مجھے اس باب میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اس سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کرتے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام آگے نہیں چل سکا۔ اس حد تک تو وہ بھی معترف ہیں کہ اسلام نے اُس زمانے میں نہایت شاداب نتائج پیدا کئے تھے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس کے بعد اسلام میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ اس قسم کے نتائج پیدا کرتا چلا جائے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ:-

(۱) کیا ایسا ہوا تھا کہ وہ قوم ان قوانین پر بدستور عمل پیرا رہی لیکن اس کے باوجود وہ ان ثمربار نتائج سے محروم ہو گئی جن سے وہ پہلے بہرہ یاب ہوئی تھی، یا اس نے ان قوانین کا اتباع چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نتائج سے محروم ہو گئی۔

(۲) اگر واقعہ یہ ہو کہ وہ قوم ان قوانین کے مطابق بدستور زندگی بسر کرتی رہی لیکن اس کے باوجود عروج و اقبال سے محروم ہو گئی تو پھر یہ سمجھنا درست ہو گا کہ ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ آگے چل سکتے۔ لیکن اگر واقعہ اس کے خلاف ہو یعنی حقیقت یہ ہو کہ اس قوم نے ان قوانین کی پابندی چھوڑ دی تھی تو پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ کیا ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں اور اگر ان پر آج بھی عمل پیرا ہوا جائے تو اس سے وہی نتائج مرتب ہو سکیں جو اس زمانے میں ہوئے تھے۔ آیئے! ان سوالات پر حقیقت پسندانہ انداز سے غور کریں اور جذبات سے الگ ہٹ کر دیکھیں کہ تاریخی شواہد اور واقعاتِ عالم کا مطالعہ ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا

پہلے ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ کیا اُس قوم نے اسلام کے اصولوں کا اتباع بدستور جاری رکھا تھا یا انہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس سلسلہ میں، میں اس مقام پر صرف چند ایک اصولوں کا ذکر کروں گا، اور وہ بھی اجمالاً۔ ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے سوال کے جواب میں سامنے آئے گا۔

ا۔ ملوکیت: ۱۔ اسلام نے اصول یہ دیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ حکومت کا فریضہ قوانینِ خداوندی کا نافذ کرنا ہے جن کا اطلاق مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہو گا حتیٰ کہ ان سے سربراہِ مملکت بھی مستثنیٰ نہیں ہو گا۔ امت کے معاملات باہمی مشاورت سے طے

ہوں گے اور معاشرہ میں عزت و تکریم کا معیار جوہرِ ذاتی اور بصیرت و کردار کی بلندی ہوگا، نہ کہ موروثی اور خاندانی وجاہت و ثروت۔ اس اصول نے ملوکیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افرادِ معاشرہ کو وہ حقیقی آزادی حاصل ہوگئی جس سے ان کی مضمر صلاحیتیں دنوں میں سرسبز و شاداب ہو کر نکھر اور ابھر آئیں۔ اس قوم نے اپنی ہمعصر اقوام میں جو اس قدر بلند امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا، اس کا بنیادی سبب یہی تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اسلام کے اس بنیادی اصول سے انحراف برت کر اپنے ہاں ملوکیت کا نظام قائم کر لیا۔ اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو استبدادِ ملوکیت کے تحت ہوا کرتا ہے ۔۔۔ یعنی شرفِ انسانیت کی تذلیل۔

۲۔ **برہمنیت**:۔ اسلام نے یہ اصول دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں۔ ہر شخص بلا کسی درمیانی واسطہ کے براہِ راست قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر سکتا ہے۔ اس سے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور یوں اس استبداد کی زنجیریں کٹ گئیں جس نے انسانیت کے قلب اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس آزادی سے انسانوں کو حریتِ فکر و نظر نصیب ہوئی اور وہ تمام رکاوٹیں دور ہوگئیں جو علمی تحقیق اور فکری کاوش کے راستے میں بُری طرح حائل تھیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ قوم چند دنوں میں علم و بصیرت کی فضائے بسیط میں بے محابا پرواز کے قابل ہوگئی۔ اس کے بعد اس قوم نے اس اصول سے سرکشی برتی اور اپنے ہاں پھر سے برہمنیت کو رائج کر لیا۔ یہ وہ عذاب ہے جس میں یہ قوم اب تک ماخوذ چلی آ رہی ہے۔

۳۔ **سرمایہ داری**:۔ اسلام نے یہ اصول دیا کہ یہ چیز وجہِ ذلتِ انسانیت ہے کہ کوئی شخص روٹی کے لئے کسی دوسرے شخص کا محتاج ہو۔ نظامِ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری لے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں اور فاضلہ دولت کسی شخص کے پاس نہ رہے۔ اس سے جہاں تمام افرادِ قوم رزق کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گئے، وہاں معاشرہ ہوسِ زراندوزی کی لعنت سے بھی پاک ہو گیا۔ اس قسم کے نظام میں عروج و ارتقاء کی راہیں جس برق رفتاری سے کشادہ ہو جاتی ہیں، اس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے مل سکتی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب اس قوم نے ملوکیت کو اپنے ہاں پھر سے رائج کر لیا، تو نظامِ سرمایہ داری کی لعنت بھی ساتھ ہی آ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری، ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ و بار ہیں۔ جب یہ قوم اسلامی اصولوں پر کاربند تھی تو حالت یہ تھی کہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ (عمر فاروقؓ) کے تہبند پر دس دس بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ لیکن جب ان میں ملوکیت بار پا گئی تو کیفیت یہ تھی کہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک جب (سیر و تفریح کے لئے نہیں) حج کے لئے چلا ہے تو چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے پہننے کے کپڑے لدے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہوگی کہ اس قوم نے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا تھا یا باقی رکھا تھا۔!

۴۔ **تکریمِ انسانیت**:۔ اسلام نے یہ اصول دیا تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس ایک اصول نے نسلی اور خاندانی تفاوت و امتیازات کی ساری عمارت منہدم کر کے رکھ دی اور وہ خطۂ ارض مساواتِ انسانیہ کے نور سے جگمگا اٹھا۔ اس معاشرہ میں حبش

کا ایک غلام (بلالؓ) سردارانِ قریش سے زیادہ واجب التعظیم قرار پا گیا کہ سیرت و کردار کی رُو سے وہ اُن سے ممتاز تھا۔ اور امیر المومنین (حضرت عمرؓ) کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے روم کے ایک مزدور (صہیبؓ) کو منتخب کیا گیا۔ نسلی امتیازات اور گروہ بندانہ تفریقات کے مٹنے کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ امت میں وحدت پیدا ہو گئی۔ یہ وہی چٹان تھی جس سے ٹکرا کر مخالفت کی ہر قوت پاش پاش ہو جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے پھر نسلی امتیازات کو بیدار کر لیا جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خلافتِ راشدہ تک تو سلطنت امتِ مسلمہ کی تھی۔ لیکن اس کے بعد مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ امت کی حکومت کہیں قائم نہیں ہوئی۔ یہ حکومتیں بنو امیہ۔ بنو عباس۔ بنو فاطمہ کی تھیں۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

۵۔ غلامی:- تکریمِ انسانیت کا فطری نتیجہ غلامی کا ختم کر دینا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عرب معاشرہ میں موجود تھے، قرآن نے انہیں رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا اور آئندہ کے لئے اس لعنت کو ختم کر دیا۔ معاشرہ میں جذب کر دہ غلاموں کو مقام کیا دیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب حضرت عمرؓ سے ان کی شہادت کے وقت کہا گیا کہ اپنے جانشین کے بارے میں آپ اپنی رائے دیدیں تو آپ نے کہا کہ اگر ابو حذیفہؓ کا آزاد کردہ غلام سالمؓ موجود ہوتا تو میں خلافت کے لئے اس کا نام تجویز کرتا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس قوم نے شرفِ انسانیت کے اس اصول کو ترک کر دیا اور اپنے ہاں غلامی کو پھر رائج کر لیا۔ نتیجہ یہ کہ خلفاء کے حرموں میں ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں ہوتی تھیں اور بغداد میں ان کی خرید و فروخت کے لئے ایک بازار مخصوص تھا جہاں حکومت کی زیرِ نگرانی انسانیت بکتی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانے کے لئے کہ اس قوم نے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ کر پھر سابقہ روش اختیار کر لی تھی۔ اتنی مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ بنا بریں، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام نے کچھ وقت کے لئے تو خوشگوار نتائج مرتب کئے تھے لیکن اس کے بعد اس میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔

کیا اسلام میں اب بھی آگے کی صلاحیت ہے؟

اس کے بعد عزیزانِ من! ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا اسلام میں ابھی آگے چلنے کی صلاحیت ہے؟ اور اس سوال کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ "اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت" تو ایک طرف، اس چودہ سو سال میں دنیا میں چلا ہی اسلام ہے۔ کوئی دوسرا نظام چلنے کے قابل ثابت ہی نہیں ہوا۔ میرا یہ جواب بڑا تعجب انگیز نظر آئے گا لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے؛ محض جذباتی نعرہ نہیں۔ اس کے لئے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو ابدی اصول اور مستقل اقدار انسانی راہنمائی کے لئے منجانب اللہ عطا ہوئے ہیں، ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ راستے کے موانعات کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھیں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ سورۂ فاطر میں ہے۔ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ۔ (۳۵/۱۰)۔ ان نظریاتِ حیات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوپر کو ابھرتے ہوئے عروج و ارتقا کی اس منزل تک پہنچ جائیں جسے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ ان نظریات کو

قرآن نے الحق کہہ کر پکارا ہے۔ اور ان موانعات کو جو ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ باطل سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس کشمکشِ حق و باطل کے متعلق کہتا ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ (۲۱/۱۸) الحق باطل پر اپنا نشانہ لگاتار رہتا ہے تاآنکہ باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے۔ اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کہتا ہے کہ اس طرح باطل کی شکست اور حق کی فتح ——— یا یوں کہیے کہ ان نظریاتِ حیات کے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي

کائناتی رفتار

يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (۳۲/۵) ان کی اس رفتار کا ایک ایک دن تمہارے حساب شمار کی رو سے ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اسے آپ انسانی تاریخ کی رفتار کہہ لیجئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ انسانوں کی کوئی جماعت ان نظریات کو اپنی زندگی میں عملاً رائج کر لے تو پھر ان کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق دنوں میں مرتب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں اس نے کہا ہے کہ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ۔ (ان نظریات میں از خود ابھرنے کی صلاحیت موجود ہے) اس کے بعد کہا ہے کہ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ۔ (۳۵/۱۰) انسانی اعمالِ صالح کی قوت انہیں نہایت تیزی سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

عقل کا تجرباتی طریق

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان اپنی عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی رو سے مسائلِ حیات کے حل کرنے کی کوشش میں لگا چلا آ رہا ہے۔ غاروں کے زمانے سے لے کر اس دورِ تہذیب و تمدن تک کی تاریخ اسی کی انہی کوششوں کی مسلسل داستان ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ (TRIAL AND ERROR) کے طریق سے معاملات کو سمجھتی اور سلجھاتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ سینکڑوں برس کی لامتناہی خارہ شگافیوں کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر پھر کوئی اور نظریہ وضع کرتی ہے۔ اور اسی طریق پر اس کا تجربہ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح صدیوں کے پیہم ناکام تجارب کے بعد وہ کسی صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ عقل کے اس تجرباتی طریق کی رو سے ایک صحیح نظریہ تک پہنچنے کے لئے جہاں انسان کو ہزاروں سال کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ وہاں آگ اور خون کی سینکڑوں خندقیں بھی پھاندنی پڑتی ہیں۔ اس کے برعکس وحیِ خداوندی انسان کو پہلے دن ہی صحیح نظریاتِ حیات عطا کر دیتی ہے۔ ان نظریات کی صداقت کو (علیٰ وجہ البصیرت) تسلیم کر کے ان کے مطابق عمل پیرا ہو جانے والی جماعت، ان راستوں کو جنہیں تنہا عقلِ انسانی نے قرن ہا قرن میں طے کیا تھا، اور وہ بھی اس قدر جانکاہ شقتوں کے بعد، چند دنوں میں، نہایت امن و سکون کے ساتھ طے کر جاتی ہے۔ اس طرح ان نظریات کے وہ نتائج، جو عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے ہزارہا سال میں جا کر برآمد ہونے تھے، چند دنوں میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی علم و عقل بھی رفتہ رفتہ، ان صحیح نظریات تک پہنچ جاتی ہے جنہیں وحی نے عطا کیا تھا۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ عقل کی راہیں بڑی طول طویل اور پُر از خطرات و صعوبات ہوتی ہیں اور وحی کی روشنی میں یہ راستہ طرفۃ العین میں طے ہو جاتا ہے اور نہایت امن و سلامتی کے ساتھ ———

افلاطون (PLATO) نے ہزاروں سال پہلے اس حقیقت کو پالیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ

یہ لاارباب فکر، کچھ بنائیں گے۔ اسے پھر مٹائیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں گے تا آنکہ وہ انسانی رستوں کو حتی الامکان خدائی رستوں سے ہم آہنگ کر لینگے۔ (REPUBLIC)

اقبال نے اسی حقیقت کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ

عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں ؛ ہر دو امیر کاروان ہر دو بمنزلے رواں

صدر اول میں اسلام

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اصل موضوع کی طرف آئیے۔ انسان تنہا عقل کی رو سے زندگی کے طول طویل راستوں پر گامزن چلا آرہا تھا۔ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا، ٹھوکریں کھاتا، ہڈیاں تڑواتا۔ کہ آج سے چودہ سو سال پہلے قندیل وحی نے ان رستوں کو یک دم روشن کر دیا۔ عرب میں بسنے والی قوم نے اس کے عطا کردہ نظریات حیات کو اپنایا اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد اس قوم نے وحی کی راہنمائی کو چھوڑ دیا اور کاروان انسانیت پھر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہ حیات پر گامزن ہو گیا۔ اب اس کی رفتار پھر سست ہو گئی۔ رفتار تو بے شک سست ہو گئی لیکن اس کا ہر قدم اٹھتا اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جس طرف اسے وحی کی روشنی لیجا رہی تھی۔ چنانچہ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان آج سے چودہ سو سال پہلے جن غلط نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے تھا اب رفتہ رفتہ انہیں چھوڑتا جا رہا ہے اور ان نظریات کی طرف آرہا ہے جنہیں قرآن نے عطا کیا تھا۔ یہ ہے مطلب میرے اس کہنے کا کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں اسلام ہی آگے چلا ہے۔ اسلام کے خلاف نظریات سب ناکام ثابت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آئیے، اس کی چند ایک مثالیں سامنے لائیں۔

۱۔ حق حکومت

چھٹی صدی عیسوی میں، ساری دنیا میں اندازِ حکومت ملوکیت تھا جس کی رو سے، راجہ کو اشور کا اوتار، قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور کسریٰ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔ عین اس ماحول میں قرآن نے آکر کہا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حق حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ مل گئی ہو کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اس ایک اصول کی رو سے قرآن نے، ملوکیت تو ایک طرف، حکومت کی کوئی ایسی شکل باقی نہ رہنے دی جس میں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اب رہا یہ کہ پھر حکومت کس طرح ہو؟ اس نے کہا کہ حکومت انسانوں کی نہیں ہوگی۔ بلکہ ان مستقل اقدار اور اصولوں کی ہوگی جو خدا کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے امت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے اپنے معاملات طے کریگی (۴۲/۳۸)۔ اس میں مذہبی پیشوائیت کا بھی کوئی دخل نہیں ہوگا اس لئے یہ نظام تھیاکریسی بھی نہیں ہوگا۔ اس اصول کے مطابق مسلمانوں

نے نظامِ حکومت قائم کیا جس کے انسانیت ساز نتائج وجۂ رشکِ اقوامِ عالم بن گئے۔ اس کے بعد اس قوم نے اس اصول کو چھوڑ دیا، اور انسان پھر تنہا عقل کی رُو سے ایک اطمینان بخش نظامِ حکومت کی تلاش میں چل نکلا۔ اب آپ دیکھئے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں انسان کا قدم ملوکیت کی طرف اٹھا ہے یا یہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا کسی ایسے نظام کی تلاش کرتا رہا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ وہ بیچارا اس تلاش میں ہزاروں خون ریزیوں اور فساد انگیزیوں کے بعد اس نظام تک پہنچ پایا ہے جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملوکیت کے مقابلہ میں جمہوری نظام، اسلام سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن چونکہ یہ نظام مستقل اقدار کے تابع نہیں اس لئے مکمل طور پر انسانی نظام نہیں بن سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان اس نظامِ جمہوریت سے مطمئن نہیں۔ خود مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور سیاستدان اس نظام کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ (مثلاً) فرانسیسی مفکر (RENE GUENN) لکھتا ہے:-

مغرب کا جمہوری نظام

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے۔ اور جو نہ پہلے کبھی وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی ..... ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ بھی کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر بیٹھے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اسی میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD.)

اقبالؒ کے الفاظ میں:-

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام ٭ جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ٭ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

٭ "اکثریت کے فیصلوں" کے متعلق ایک اور مفکر، پروفیسر الفریڈ کوبن لکھتا ہے کہ:-

(یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے) اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔

(THE CRISIS OF CIVILISATION.)

پروفیسر کوبن نے کہا ہے کہ "فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو" سوال یہ ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ معیار وہ مستقل اقدار ہیں جو وحی کی رُو سے عطا ہوتی ہیں۔ دیکھئے اس باب میں اٹلی کا مشہور مدبر، میزینی کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے

ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت قائم رکھ سکتی ہے لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقاید نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے۔ اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا بہت سے انسان (جمہوریت)۔ بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کوئی شے ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو۔ تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے۔ خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیں خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ حکومت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہے تو تمہارا حق ہی نہیں فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(C.F. GRIFFITH — INTERPRETTERS OF MAN.)

ہم سمجھتے ہیں کہ گریفتھ نے بات دو ٹوک الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ عصرِ حاضر کی ساری کشمکش یہی ہے۔ سیکولر اصولِ سیاست جس کے سب سے بڑے علمبردار مارکسی فلسفہ کے مدعی ہیں یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کوئی نہیں۔ انسان اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے میں اختیارِ مطلق رکھتا ہے۔ اس کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اس کے برعکس، اسلام نے یہ کہا تھا کہ اگر انسان امن و سلامتی سے ترقی کی راہیں طے کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے فیصلوں کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار مستقل اقدار کو قرار دے۔ گریفتھ نے یہی کہا ہے۔ دیکھئے کہ اس باب میں دیگر مفکرین کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر (BREND) عصرِ حاضر کی بے لگام سیاست کے متعلق لکھتا ہے۔

انسانوں کی کوئی جماعت ہو، ایک فرد کو، ایک محدود حلقہ کے اندر اور خاص شرائط کے ماتحت ہی جذبات کی آزادی دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنے جذبات کو اس محدود حلقہ سے باہر اور ان مخصوص شرائط کو توڑ کر بروئے کار لانے کی کوشش کرے تو وہ جماعت اس کی روک تھام کی تدبیر کرتی ہے۔ لیکن آج کوئی ایسا اقتدارِ اعلیٰ نہیں جو اقوام پر بھی اسی قسم کی پابندی عاید کر سکے۔ اس لئے اقوام کو اپنے جذبات کو بے زمام چھوڑنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ آج اقوامِ عالم کی حالت بالکل عہدِ طفولیت کی سی ہے جس میں بچہ ہر اس پابندی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے جذبات کے راستے میں حائل ہو۔

(FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICT.)

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو ❋ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہاں دین سے مراد یہی مستقل اقدار خداوندی ہیں نہ کہ مذہبی پیشوائیت کے وضع کردہ رسوم و عقاید۔

جس زمانے میں متحدہ اقوام کا "حقوق انسانیت کا منشور" زیر تدوین تھا، اس کے ادارہ (UNESCO) نے اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کر کے دنیا بھر کے مفکرین اور سیاستدانوں کے پاس بھیجا۔ اس ادارہ نے بعد میں ان مشاہیر کے جوابات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا تھا جس کا تعارف (JACQUES MARITAIN) نے لکھا تھا۔ اس نے اس تعارف میں کہا تھا کہ:

> انسانیت کے حقوق کی (DEFINITION) کی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہولیا جائے۔ حقوق انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو فلسفہ زندگی کہا جاتا ہے۔

"فلسفہ زندگی" "مستقل اقدار" کا دوسرا نام ہے۔ اسی کو اخلاقیات کہا جاتا ہے اور اخلاقیات کے متعلق راشڈل لکھتا ہے کہ:

> ان سے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔
>
> (THE THEORY OF GOOD AND EVIL - VOL: II)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ:

> مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہیئے۔ جسے ہر شخص تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔ (BETWEEN MAN AND MAN)

یہ اقدار ملتی کہاں سے ہیں، اس کے متعلق غور سے سنیئے، اور سننے سے پہلے سمجھ لیجئے کہ اس کا کہنے والا کوئی ملا یا پادری نہیں۔ کہنے والا عصر حاضر کا سب سے بڑا سائنٹسٹ آئن سٹائن ہے۔ وہ کہتا ہے:

> یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جا سکتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقل انسانی پر نہیں ہوتی لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔
>
> (OUT OF MY LATER DAYS)

جس نظام میں ان اقدار کو نظرانداز کر دیا جائے اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق اس عالمگیر شہرت کے حامل دانشور کی زبان سے سنیئے جس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ یعنی (THE MAKING OF HUMANITY) کا مصنف "بریفا"۔ وہ لکھتا ہے:

> انسانی جمعیت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے:

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو' آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی شخص کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے' اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار تباہ ہو جاتی ہے۔

عدل کا مفہوم

برخلاف یہاں کسی نظام کی کامیابی کے لئے عدل کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ عدل کا عمومی مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروجہ قانون کے مطابق ہو وہ عدل کہلائے گا۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے کو عدل کہا جائے گا۔ لیکن جس قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے اگر وہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اس لئے اس نے کہا کہ ملک کے قوانین کو الحق کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یعنی مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق۔ (دیکھئے) تاکہ جو فیصلے اس قانون کے مطابق کئے جائیں وہ فی الواقعہ مبنی بر عدل کہلا سکیں۔ دیکھئے اس باب میں دورِ حاضر کا ایک مشہور فلسفہ قانون کا ماہر (EMIL BRUNNER) کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (JUSTIC AND THE SOCIAL ORDER) میں لکھتا ہے۔

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے' وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین' معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض چھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ قرآن کریم نے اصول یہ دیا تھا کہ:-

(۱) کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس لئے ملوکیت، آمریت وغیرہ سب نظامِ حکومت باطل ہیں۔ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔

(۲) لیکن اس مشاورت میں ایک شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔ اور وہ یہ کہ کوئی فیصلہ ان اقدار کے خلاف نہ ہو جو حقِ مطلق کی حیثیت رکھتی ہیں اور وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔

ایک قوم نے آج سے چودہ سو برس پہلے اس اصول کو نظامِ حیات بنایا اور دنیا نے اس کے نتائج دیکھ لئے۔ اس کے بعد اس قوم نے اس اصول کو ترک کر دیا اور باقی دنیا کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ گئی۔

(۳) اس کے بعد عقل کے تجرباتی طریق نے انسان کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ملوکیت، آمریت وغیرہ نظام غلط ہیں۔

ان کے برعکس نظامِ مشاورت صحیح نظام ہے جسے جمہوریت کہا جاتا ہے

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس حد تک، دنیا میں اسلام کا پیش کردہ اصول آگے چلا ہے یا وہ اصول جو پیچھے سے چلا آرہا تھا اور اسلام نے اسے باطل ٹھہرایا تھا۔

(۲) لیکن ہمارے زمانہ تک عقلِ انسانی ہنوز اسلامی اصول کے ایک حصہ کو اپنا سکی ہے یعنی ملوکیت کی جگہ مشاورتی نظام کو۔ اس اصول کے دوسرے حصہ یعنی یہ کہ اس مشاورت کو مستقل اقدار کے تابع رہنا چاہیئے۔ تک ابھی نہیں پہنچ سکی۔ بایں ہمہ اسلامی اصول کے اس حصہ کی صداقت اور اہمیت دورِ حاضر کے مفکرین کی نگاہوں کے سامنے آرہی ہے اور وہ اس پر زور دے رہے ہیں کہ اسے بھی اپنایا جائے۔ وہ دن دور نہیں جب انسان اس اصول کو اپنانے پر بھی مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس نظامِ زندگی کے حیات سوز اور تباہ کن اثرات جسے عصرِ حاضر نے مستقل اقدار کو نظر انداز کر کے تعمیر کیا، اس قدر نمایاں طور پر سامنے آچکے ہیں کہ خود وہ قومیں جنہوں نے اس نظام کو متشکل کیا تھا ان کی وحشت سامانیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھی ہیں۔ اس چیخ و پکار کی تفصیل میں جانے کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت[1] ہوگی۔ میں اس مقام پر دو ایک اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے لارڈ اسنل (SNELL) نے (THE NEW WORLD) کے نام سے ایک اہم کتاب لکھی تھی۔ وہ اس میں کہتا ہے۔

> نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ وسعتوں اور پہنائیوں میں ان سے بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی ایک مقصد کے لئے ۔۔ کبھی خام پیداوار کے لئے، کبھی مال کی منڈیوں کی تلاش میں، کبھی دفاعی مقصد کی غرض سے ۔۔ وہ لڑائیاں خاندانی وجاہت اور مادی تفوق کے لئے ہوتی تھیں لیکن گذشتہ جنگ (یعنی دوسری جنگِ عظیم) کو دیکھیے۔ اس کی ظلمت انسانی قلب کی گہرائیوں میں دکھائی دیگی۔ نسلی افتخار، جذباتِ تغلب و تسلط۔ اور مملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔
>
> لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی نہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانے پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں ۔۔۔۔ انسانیت اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔ یہ مصیبتیں نتیجہ ہیں ان میکانکی قوتوں کا جنہیں انسان نے ایجاد تو کر دیا لیکن ان پر قابو پانا نہ سیکھا۔ ہر جگہ ریب و شکوک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ زندگی اس بیم و رجا، فتح و شکست، امید و یاس کے دوراہے پر کھڑی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" جس سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں۔

ہے۔ اگر ہم نے اپنی ناتواں زندگیوں کی شکستہ عمارت کو از سرِ نو محکم بنیادوں پر استوار نہ کیا تو ہماری تقدیر بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔

حکیم مشرق نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:-

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

یہ تو ہے عصرِ حاضر کی اندازِ فراموش دنیا کی اجتماعی زندگی کا نقشہ۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، علم تحلیل نفسی کے عظیم محقق ڈاکٹر ینگ نے آج سے بہت پہلے لکھا تھا کہ:-

عصرِ حاضر کا انسان مخلوق انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں ان وحشیانہ قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت۔ اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے، جہاں تعمیر و تخریب کی قوتیں ہر وقت ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

(MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL.)

عصرِ حاضر کے راہ گم کردہ انسان کی یہی وہ قلبی کیفیت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

عشق ناپید و خرد میگزدش صورتِ مار ٭ عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا ٭ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو ناکام کہنے والوں سے کہ اقوامِ دورِ حاضر کی یہ چیخ و پکار اسلامی نظامِ زندگی کی طرف دعوت دے رہی ہے یا اس سے دور بھاگنے کی تلقین کر رہی ہے؟

نظریۂ قومیت

اب ایک اور سوال کو سامنے لائیے۔ انسان نے جب مل جل کر رہنے کی زندگی شروع کی تو اسے لامحالہ کسی ایسی بنیاد کی تلاش ہوئی جس سے افراد مل کر ایک جتھہ بن سکیں۔ اس دور میں یہ بنیاد خون کے رشتوں کے سوا اور کونسی ہو سکتی تھی۔ اس سے ایک خاندان کے افراد مل کر ایک جتھہ بن گئے۔ انہی خاندانوں نے وسعت اختیار کر کے قبائل کی شکل اختیار کر لی۔ اور قبائل وسیع تر ہو کر نسلی امتیازات کے حلقے بن گئے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں یہی امتیازِ قومیت کا معیار تھا۔ اسلام نے یہ انقلابی آواز اٹھائی کہ قومیت کا یہ معیار غلط ہے۔ اس وقت بھی اس کے نتائج بڑے خطرناک مرتب ہو رہے ہیں لیکن جب انسانی آبادی اور بڑھی اور وسائلِ رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات عام ہوئے تو قوموں کا باہمی تصادم خود نوعِ انسانی کو تباہ کر دے گا۔ اس نے کہا کہ قومیت کا

معیار، خون، رنگ، نسل، زبان کے اشتراک کے بجائے، فکر و نظر کی ہم آہنگی ہونا چاہیئے۔ اسی کو آئیڈیالوجی یا ایمان کا اشتراک کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اس اشتراک کو کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ (۲۱۳)۔ اسے تمام نوعِ انسان کو محیط ہونا چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر، اس نے کہا کہ رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اشتراک کی بنا پر مختلف قومیں تشکیل کرنے کے بجائے نظریاتِ زندگی کے اشتراک کی بنا پر عالمگیر انسانیت کی برادری کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ اس بنیاد پر اس نے ایک امت کی تشکیل کی جس نے زندگی کے غلط نظاموں کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس امت نے بھی اس اصول کو فراموش کر دیا اور پھر اپنی قدیم معیاروں کے مطابق ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے بعد دنیا، عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے اسلام کے پیش کردہ اصولِ اجتماعیت کی طرف آ رہی ہے یا اسکے خلاف جا رہی ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی تفریق کی بدترین شکل ہندوستان میں رائج تھی جہاں بھارت سے باہر کے انسانوں کو انسان نہیں بلکہ ملیکش (ناپاک حیوان) سمجھا جاتا تھا اور بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کو چار ورنوں (ذاتوں) ـــــ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر ـــــ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم امٹ تھی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ برہما کی بنائی ہوئی ہے اور اس لئے ان کے دھرم کا بنیادی حصہ ہے۔ آج وہاں یہ ساری تقسیم آئینی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ انسانی معاشرہ کی یہ تبدیلی قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کی کامیابی کا ثبوت ہے یا اس کی ناکامی کی دلیل! اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ اس سے پہلے دنیا کی ساری آبادی مختلف نسلوں میں بٹی ہوئی تھی ـــــ اصولی طور پر سیاہ، سفید، سرخ اور زرد نسلوں میں۔ اور فروعی طور پر ہر نسل کے اندر سینکڑوں شاخوں میں۔ عصرِ حاضر کی سائنٹیفک تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسلوں کی یہ تفریق یکسر غیر فطری ہے۔ کسی نسل کو دوسری نسل پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ اور عملاً ان نسلوں کا امتیاز مٹتا چلا جا رہا ہے۔ کہیئے کہ دنیا اسلام کے قریب آ رہی ہے یا اس سے دور چلی جا رہی ہے۔؟

لیکن عقلِ انسانی کا تجرباتی عمل، ابھی یہیں تک پہنچ سکا ہے۔ اس نے ہنوز انسان کو وطن کی تنگنائے سے نہیں نکالا۔ یعنی اب انسانوں کی تفریق اور قوموں کی تقسیم، وطن کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے وضع کردہ اس نظریہ کے نتائج سے مطمئن ہے یا اس کے ہاتھوں نالاں ہے۔ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، خود اس نظریہ پر عمل پیرا اقوامِ مغرب کی زبانی سنیئے۔ پروفیسر الفریڈ کوبن جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے:۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان قوموں کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے خود مختاری کی مدعی ہوں۔ ان وجوہات کی بنا پر لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے نیشنلزم کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔

پروفیسر میتیس اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے کہ

جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے جس طرح افراد میں باہمی تنازع کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

پروفیسر ولیم برنڈ نے، دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ

اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوامِ یورپ چند سال تک عملی نبرد آزمائی میں نہیں الجھیں گی کیونکہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے لیکن نیشنلزم کا وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے، باقی رہے گا۔ اس لئے مستقبل میں جنگ کو ختم کرنے کے لئے آج کی سیاست دانی کی پرکھ اسی سے ہو گی کہ موجودہ جنگ کے بعد نیشنلزم کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔

(FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICT.)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD) میں لکھتا ہے

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھنے میں مانع ہے۔ وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ (عجب تماشہ یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ یورپ نے نیشنلزم کو محض ایک سیاسی مسلک کی حیثیت سے ہی اختیار نہیں کیا بلکہ اسے مذہب کی پوزیشن دے رکھی ہے۔ وہاں وطن کو ایک دیوتا سمجھا جاتا ہے جس کی پرستش ہوتی ہے۔ آلڈوس ہکسلے اس باب میں بڑی وضاحت سے لکھتا ہے اور بہ تکرار و اصرار لکھتا ہے کہ:۔

نیشنلزم ایک بت پرستانہ مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ وہ مذہب جو فساد و تفریق انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی خدا پرست مذہب، فلاح اور وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا سا مسلک ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا ملکی مذہب ہے۔ یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے، ہر ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملیکشی تصور کرتا ہے نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت، خدا کے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقاید باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفا کے عقاید پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جراثیم نہیں اس کا وجوب ہوتا ہے۔

یاد رکھیئے! ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے۔[1]

ضمناً، ہیکٹلے نے نیشنلزم کو آج ایک "باطل خدا" کہا ہے۔ اقبالؒ نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کہا تھا کہ:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس کا نتیجہ یہ بتایا تھا کہ:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ۔ تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ۔ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور اس کے بعد مسلمانوں سے تاکید کی تھی کہ:

اے مصطفویؐ! خاک میں اس بت کو ملا دے

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس نیشنلزم کے ہاتھوں جسے اسلام نے فسادِ آدمیت کی بنیاد قرار دیا تھا، خود اقوامِ مغرب کے مفکر اور سیاست دان اس قدر گریاں و نالاں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو چلا ہوا کارتوس کہنے والوں سے کہ اقوامِ یورپ کا یہ واویلا، اسلامی اصولِ قومیت کی صداقت کی شہادت ہے یا اس کے ناکارہ ہونے کی دلیل!

یہ اس مسئلہ کا منفیانہ پہلو تھا۔ یعنی نیشنلزم کی تباہ کاریوں کے خلاف اقوامِ مغرب کا نالہ و شیون۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اس فساد کا علاج کیا ہے؟ پروفیسر برنڈ نے کہا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم قومیت کی جگہ بین الاقوامیت (انٹرنیشنلزم) کو فروغ دیں۔ اس کے خلاف مسٹر (EMERY REVES) نے کہا کہ:

ہم انٹرنیشنلزم سے بھی کافی کھیل چکے ہیں۔ (اقوامِ متحدہ کی ناکامی اس کا بین ثبوت ہے)، جو مسئلہ دنیا کے سامنے ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ نیشنلزم خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے اس کا حل دریافت کر دے۔ اس کا حل انسانی عالمگیریت

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے میری کتاب ـــــ انسان نے کیا سوچا؟ ـــــ (ص ۲۴۱ - ۲۴۰)

ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جاکر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔

(THE ANATOMY OF PEACE.)

کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ اُسقف (TEILARD - OF - CHARDIN) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب (BUILDING OF THE - EARTH) میں لکھتا ہے :-

اب اقوام کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب میں جس کا نام ہی اس نے (THE - COMMUNITY OF MAN) رکھا ہے، لکھتا ہے۔

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداً میں موجود تھی۔ لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑ دے۔ انسانی ارتقار کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

جی نہیں چاہتا کہ میں یہ کہے بغیر آگے بڑھ جاؤں کہ جو کچھ اس مفکر نے کہا ہے وہ گویا قرآنی آیات کا ترجمہ ہے قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱۹) نوعِ انسان شروع میں ایک ہی برادری تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا اور مختلف خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ اس میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملی۔ (۲/۲۱۳) اس نے کہا ہے کہ انسانیت کی بارگاہ میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جو يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (۲/۲۷) جس بکھری ہوئی انسانیت کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور اس طرح دنیا میں فساد برپا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ قرآن کریم کی ان آیاتِ جلیلہ پر غور کیجئے اور پھر پروفیسر ملر کے مذکورہ بالا اقتباس کو دیکھئے اور پھر بتائیے کہ کیا وہ انہی آیات کا ترجمہ نہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اپنے غلط نظریات کا ستایا ہوا انسان آخر الامر کس آستانہ پر پہنچ کر پکارتا ہے کہ

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی ؏ میرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

انسان جس عالمگیر انسانی برادری کی تلاش میں ہے اس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا۔ اس کے متعلق سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات (GUNNER MYRDAL) لکھتا ہے۔

> یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہوسکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں۔ اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پہ یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دیگی۔

اور اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے کہ

> ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔

(BEYOND THE WELFARE STATE)

اس "مذہب" کے متعلق' جو (MYRDAL) کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے' ایک اور ممتاز مفکر (ERIC FROMM) لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو

> انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطہ اخلاق دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔ (THE SANE SOCIETY)

وقت نہیں' ورنہ میں عزیزانِ گرامی قدر کو بتاتا کہ قرآن کریم کس طرح اس دین کی یہی خصوصیات بتاتا ہے جسے اس نے عالمگیر انسانیت کے لئے بطور ضابطۂ حیات تجویز کیا ہے۔ اس مفکر نے کہا ہے کہ زمانے کے تقاضوں کی رُو سے اس مذہب کی نمود ہوگی۔ اور قرآن کریم نے یہی طریق اپنے مستور حقائق کی نمود کے لئے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (۴۱/۵۳)

(جوں جوں علم انسانی ترقی کرے گا اور انسانی تقاضے بڑھیں گے) عالم الفس و آفاق کے مستور حقائق بے نقاب ہوتے جائینگے۔ اور جوں جوں یہ حقائق بے نقاب ہوں گے۔

یہ حقیقت سامنے آتی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے کہا تھا وہ صداقت پر مبنی تھا۔

یہ مذہب اسلام ہی ہوسکتا ہے

اب رہا یہ سوال کہ دنیا کو جس عالمگیر مذہب انسانیت کی تلاش ہے کیا وہ اسلام کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں۔ ایک غیر مسلم کی زبان سے سنیئے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ غیر مسلم کون ہے اور کس پایہ کا مفکر ہے۔ یہ عصر حاضر کا سب سے بڑا مؤرخ، پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE WORLD AND THE WEST) میں لکھتا ہے ـــــ اور دیکھئے کہ وہ ایسا لکھتے وقت ہمارے منہ پر کتنے زور سے طمانچے مارتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعث فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متأثر ہوتے جا رہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلا لحاظ اختلاف نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ، محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جب کہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں "فاصلہ" کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے .... مسلمانوں کا اخوت باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں، محض قومیت کے معیار پر درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم و بیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہو سکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اس کے تصورات حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مؤدت و اخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصور، ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔

پروفیسر ٹوئن بی کے نزدیک، دنیا میں عالمگیر برادری متشکل کرنے کا واحد ذریعہ اسلامی نظریہ اجتماعیت ہے۔ اور اسے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اگر یہ نظریہ بھی باقی نہ رہا تو دنیا کا کیا حشر ہوگا! میں پوچھنا چاہتا ہوں

اپنے ہاں کی فریب خوردہ ذہنیتوں سے کہ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے' یا دنیا اسے اپنی نجات کے لئے آخری سہارا قرار دے رہی ہے! اور پھر میں پوچھنا چاہتا ہوں قومیت زدہ مسلمانوں سے کہ وہ سوچیں کہ دنیا ان کے ساتھ کیا توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے' اور وہ کس طرف جا رہے ہیں؟ غالب نے کسی ایسے ہی حسرت آمیز منظر سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں!

(۰)

نظامِ سرمایہ داری

اب میں' عزیزانِ من! انسانی زندگی کے ایک اور اہم گوشے کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ گوشہ ہے جس نے عصرِ حاضر میں خاص طور پر بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی معاشی نظام کا مسئلہ۔ انسانی زندگی کا مدار زمین کی پیداوار پر ہے۔ جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی اس نے دیکھا کہ اس ذریعۂ زیست پر بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں پر قبضہ چلا آ رہا ہے اور وہ اپنی مقبوضہ زمین پر مزارعوں ہی سے نہیں' غلاموں سے کام کراتے ہیں۔ قرآن نے آکر یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ نہ ذرائع پیداوار پر افراد کی ملکیت ہو سکتی ہے' نہ کسی انسان کے پاس اس کی ضروریات سے زاید (فاضلہ) دولت رہ سکتی ہے۔ اس سے ایک طرف کو غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دوسری طرف نظامِ سرمایہ داری کی بساط الٹ گئی۔ اور قرآن کی حامل قوم نے ایسا معاشرہ متشکل کر کے دکھا دیا جس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم تھا اور نہ ہی کوئی تن آسان دولت پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا۔ اس طرح دنیا کو پتا دیا گیا کہ یہ نظام ممکن العمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ مسلمانوں نے کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کو ختم کر دیا اور قرآنی اصول پھر اپنی کاہنانی رفتار سے آگے بڑھنے لگے۔

آپ سوچئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں' انسان کے قدم نظامِ سرمایہ داری کی طرف اٹھے ہیں یا اس نظامِ معیشت کی طرف' جسے قرآن نے وجۂ حریتِ انسانیت قرار دیا تھا! آج اس باب میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آج اس نظام کا غلغلہ ساری دنیا میں بلند ہو رہا ہے۔ کیا یہ اس امر کی زندہ شہادت نہیں کہ اسلامی نظامِ معیشت ہی آگے چلا ہے اور اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے حیات بخش نظام بن سکے۔ لیکن عقل کا تجرباتی طریق ابھی اس نظام کے مادی پیکر تک پہنچ سکا ہے۔ اس کی روح تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ اس کی بالائی عمارت کو چھو سکا ہے۔ اس کی بنیادوں کو ابھی نہیں پا سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ نظام' اول تو اپنی پہلی منزل — یعنی سوشلزم — میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہے۔ آخری منزل — کمیونزم — تک پہنچ ہی نہیں پایا۔ اور دوسرے' سوشلزم' بھی ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے جھگڑوں کے زور سے فضائے عالم پر چھا جانے کی کوشش میں مصروف ہے قلب و دماغ کے اطمینان سے زندگی کی بنیاد نہیں بن رہا۔ یہ اس لئے کہ اس قسم کے معاشی

نظام کی بنیاد جس تصورِ حیات پر استوار ہو سکتی ہے وہ اس کی نگاہوں سے ہنوز اوجھل ہے۔ وہ بنیاد ہے مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت پر ایمان ——— وہ ایمان، جس کی بنا پر اس ذمہ داری کو قبول کرنے والے (عمرؓ فاروق) نے کہا تھا کہ:

> اگر (انسان تو ایک طرف) دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی باز پُرس ہوگی۔

"باز پرس" کا اس قسم کا احساس صرف حیاتِ آخرت کے ایمان سے پیدا ہوتا ہے، اور جب تک یہ احساس بیدار نہ ہو یہ معاشی نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ گوئٹے نے کس قدر بلیغ انداز میں کہا ہے کہ تسلسلِ حیات کے بغیر تو اس دنیا کی زندگی بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ میں کیوں نہ اس کے اپنے الفاظ (QUOTE) کر دوں۔ اس نے کہا ہے کہ

THAT MAN IS DEAD EVEN IN THIS LIFE
WHO HAS NO BELIEF IN ANOTHER[ؔ۱]

سوشلزم عقل کے تجرباتی طریق کا قدمِ اوّل ہے۔ اس کے عملی نفاذ کے بعد جب اس تجربہ میں مزید اضافہ ہوگا تو وہ اس بنیاد تک بھی پہنچ جائے گی جس کے بغیر یہ عمارت استوار نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر روس کے متعلق کہا تھا کہ:

فکرِ او در تند بادِ لَا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آید بروں

اس لئے کہ:

در مقامِ لَا نیاساید حیات سوئے اِلّا می خرامد کائنات

———(٥)———

بنیادی حقوقِ انسانیت

ہمارے زمانے میں بنیادی حقوقِ انسانیت (FUNDA=MENTAL HUMAN RIGHTS) کا بڑا چرچا ہے اور اقوامِ متحدہ (U.N) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ان حقوق کو متعین کر کے ان کا چارٹر شائع کر دیا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بنیادی حقوق کا تصور سب سے پہلے قرآن کریم نے دیا تھا اور انہیں نہایت وضاحت سے بیان بھی کر دیا تھا۔ قلتِ وقت کی بنا پر میں ان حقوق

ؔ۱ QUOTED BY DIXON, IN, THE HUMAN SITUATION. (P.428)

کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ اس لئے اجمالاً چند ایک کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ دیکھئے، قرآنِ کریم کی رُو سے وہ حقوق کیا ہیں:-

(۱) تکریمِ آدمیت۔ یعنی ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے۔

(۲) جنسی مساوات۔ زندگی کے کسی شعبہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں۔

(۳) مدارج کا تعین افراد کے جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی رُو سے کیا جائے گا۔

(۴) اطاعت صرف قانون کی ہوگی۔ اشخاص کی نہیں۔

(۵) ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اسے عدل کہا جاتا ہے۔ اور جس شخص میں کوئی کمی ہوگی اس کی کمی پوری کی جائے گی۔ اسے احسان کہا جاتا ہے۔

(۶) ہر شخص کو رزق (سامانِ زیست) مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔

(۷) جان کی حفاظت کا حق۔

(۸) جو چیز قانوناً کسی کی ملکیت میں دی جائے اس کی حفاظت کا حق۔

(۹) سکونت کا حق۔

(۱۰) عصمت کی حفاظت کا حق۔

(۱۱) شادی میں انتخاب کا حق۔

(۱۲) حسنِ ذوق (AESTHETIC TASTE) کا حق۔

(۱۳) مذہبی آزادی کا حق۔

(۱۴) سچی بات کہنے کا حق۔

(۱۵) مظلوم کو فریاد کا حق۔

(۱۶) ہرائیویسی کا حق۔

(۱۷) حیثیت عرفی کے تحفظ کا حق۔

(۱۸) اثباتِ جرم کے بغیر ہر ایک کو بے گناہ تصور کئے جانے کا حق۔[1]

یہ اور اسی قسم کے دیگر حقوق کا تعین قرآن کریم نے اُس زمانے میں کیا جب دنیا میں افراد کے حق کا تصور بھی کہیں نہیں تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں انسانی فکر نے ان حقوق کا تقاضا کیا ہے یا اس نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے! اور اگر اس نے ان حقوق کا مطالبہ کیا ہے تو کیا یہ اسلام کی کامیابی کی دلیل ہے یا اس کی ناکامی کا ثبوت؟ اسلام کی ناکامی تو ایک طرف فکرِ انسانی اس باب میں بھی ہنوز اسلام سے پیچھے ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو ابدی اور غیر متبدل قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کا کوئی نظام ان میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس، اقوامِ متحدہ کے متعین کردہ حقوق کی کیفیت کیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ میں نے اس سے پہلے (UNESCO) کے جس کمیشن کا ذکر کیا ہے اس نے ان حقوق کے متعلق اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ یہ تمام حقوق بالآخر انسانی حقوق ہیں اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عاید کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدل قرار دیا جائے۔
> حتیٰ کہ جن حقوق کو بلاشروط کہا جاتا ہے، ان میں بھی ان حقوق کا مالک ہونے اور ان

---

[1] ان تمام حقوق کے قرآنی حوالے میرے مجموعہ مضامین "بہارِ نَو" میں ملیں گے۔

کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے لیکن ان کا استعمال ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از روئے قانون عاید کی جائیں گی۔

اور "از روئے قانون" ان حقوق کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے اس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں! یہی وجہ ہے کہ یونیسکو کے سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر (QUINCY WRIGHT) نے کہا تھا کہ:-

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوق انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں۔ ان سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔

یہ اس لئے کہ دنیا کی ہر مملکت اپنے آپ کو اقتدارِ مطلق (ساورنٹی) کی مالک سمجھتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو پامال کر دے۔ تو اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہوگا۔ ان کے برعکس، قرآنی مملکت پر مستقل اقدارِ خداوندی کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر فیصلہ اور عمل کے لئے قانون مکافات کی عدالت میں جواب دہ ہوتی ہے۔ فکر انسانی کا تجرباتی طریق ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا جس کی وجہ سے بنیادی حقوق کے چارٹر تو شائع ہو جاتے ہیں' ان پر عملدرآمد کہیں نہیں ہوتا۔

اس مقام پر عزیزانِ من! میں ایک اور اعتراض کی طرف آنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے

مسلمان یونہی کہہ دیتے ہیں

کہ مسلمانوں کی یہ عادت ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی اچھا نظریہ سامنے آیا، انہوں نے کہہ دیا کہ اسلام میں یہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ جب مسلمان لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر صحیح نظریہ پہلے ہی سے اسلام کے اندر موجود ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔ اور ان کے اس قسم کے دعوے کا ان کے پاس ثبوت کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں اور متعین اتھارٹی کی بنا پر کہتا ہوں۔ میری اتھارٹی قرآن کریم ہے جس کے متعلق ساری دنیا کو تسلیم ہے کہ وہ چودہ سو سال سے دنیا میں بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔ میں نے جو کچھ اس وقت کہا ہے (یا اس سے پہلے بھی جو کچھ کہتا چلا آرہا ہوں) ان میں سے ایک ایک دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیات موجود ہیں اور جب بھی کوئی طلب کرے انہیں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔

حقائق ابدی پر مدار ہے اس کا
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

غلط فہمی کی وجہ

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اسلام آگے نہیں چلا" جہاں تک میں نے غور کیا ہے' ان کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ وہ (وہم) مسلمانوں کو اور اسلام کو مترادف سمجھ لیتے ہیں اور اسی وجہ سے پوری جرأت کیساتھ کہہ دیتے

ہیں کہ اگر اسلام میں فی الواقعہ ایسی صلاحیت موجود ہے جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو پھر مسلمانوں کی حالت اس قدر پست کیوں رہی ہے؟ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کا بندھا ٹکا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اسلام میں تو اس کی صلاحیت موجود ہے لیکن ہم مسلمان اس پر کاربند نہیں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن جب وہ پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے جس پر کاربند نہ ہونے سے مسلمانوں کی یہ حالت ہو چکی ہے تو اس کا جواب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ یہ نماز نہیں پڑھتے۔ روزے نہیں رکھتے، ان کی وضع قطع، تراش خراش سچے مسلمانوں جیسی نہیں۔ یہ شراب پیتے ہیں، فسق و فجور میں مبتلا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب معترضین یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ایسے مسلمان بھی تو ہیں جو نماز روزے کے بھی پابند ہیں اور فسق و فجور میں بھی مبتلا نہیں، پھر ان کی حالت بھی ویسی ہی کیوں رہی ہے، تو اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

یاد رکھیئے! جب تک ہم اس اعتراف اور اعلان کی جرأت نہیں کرتے کہ ہمارا مروجہ اسلام وہ اسلام نہیں جسے خدا نے متعین کیا تھا اس وقت تک ہم نہ ان اعتراضات کا کوئی اطمینان بخش جواب دے سکتے ہیں نہ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکتے۔ وہ اسلام، خدا کی کتاب (قرآن کریم) کے اندر محفوظ ہے۔ مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لینے کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے مشاہیر بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یوں غیر شعوری طور پر مخالفین کے اعتراض کی تائید و تقویت کا موجب بن جاتے ہیں۔ اگلے دنوں، صدر مملکت، مسٹر بھٹو نے ایمسٹرڈیم کے ایک میگزین (ELSEVIERS) کے چیف ایڈیٹر (VAN ROSMALEN) کو ایک انٹرویو دیا۔ بات مسلمانوں کے اتحاد کی چلی، اور ایسا نظر آتا ہے کہ اس میں اشارہ مشرقی پاکستان کے جداگانہ مملکت بن جانے کی طرف بھی تھا۔ صدر بھٹو نے اس ضمن میں کہا:-

> ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک یہ نعرے بلند ہوتے رہے کہ چونکہ ہمارا خدا ایک ہے اور قرآن بھی ایک، اس لئے ہماری زبان بھی ایک ہی ہونی چاہیئے اور ملت بھی ایک۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارا خدا بھی ایک ہے اور قرآن بھی ایک لیکن اگر خدا اور قرآن پر ایمان رکھنے والی مملکتیں سینکڑوں کی تعداد میں بھی ہو جائیں تو بھی خدا ایک اور قرآن ایک ہی رہے گا۔ (پاکستان ٹائمز - ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

جہاں تک "ایک زبان" کا تعلق ہے یہ ٹھیک ہے کہ ایک خدا اور ایک قانون کا فطری نتیجہ ایک زبان نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے نہ اس کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی ایسا مطالبہ۔ اس نے تو اختلاف الوان و السنہ (رنگوں اور زبانوں کے اختلاف) کو منجملہ آیات اللہ قرار دیا ہے۔ (۳۰/۲۲) لیکن جہاں تک ایک قوم ہونے کا تعلق ہے، اسلام نے خدا کے ایک اور قرآن کے ایک ہونے کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کا ایک قوم ہونا قرار دیا ہے اگر خدا کی وحدانیت اور اس کی کتاب کی یکتائیت پر ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود، یہ قوم امتِ واحدہ نہیں بنتی تو سمجھ لیجئے کہ اس قوم کا نہ خدا کی وحدانیت پر ایمان ہے نہ قرآن کی یکتائیت پر یقین۔ یہ مروجہ اسلام ہے جس میں، خدا اور قرآن پر ایمان کے دعوے کے باوجود مسلمان مختلف قومیتوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ قائد اعظم سے بھی یہ سوال کیا گیا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر اختلافات اور تفرقات ہیں۔ ان میں

وحدت کی صورت کیا ہوگی، تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ جب ہمارا خدا ایک، رسول ایک اور قرآن ایک ہے تو ہم ایک امت کیوں نہیں بن سکیں گے۔ اس سے ان کا مطلب یہی تھا کہ جب ہم اپنی مملکت میں مستقل اقدارِ خداوندی کو بطور ضابطۂ حیات نافذ کریں گے اور اس طرح مسلمانوں کو وحدتِ خداوندی کی عملی تعلیم دیں گے تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایک امت نہیں بن سکیں گے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ایک خدا اور ایک قرآن کے ماننے کے باوجود مسلمان مختلف قومیتوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ باقی رہا مسٹر بھٹو کا یہ کہنا کہ ایک خدا اور ایک قرآن کے باوجود مسلمانوں کی مختلف مملکتیں ہو سکتی ہیں، تو یہ ٹھیک ہے کہ جغرافیائی اور مقامی حالات کے تقاضوں کی رُو سے، ایک سے زیادہ مملکتیں باقی رکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت محض انتظامی وحدتوں کی ہوگی۔ جب ان تمام مملکتوں کا ضابطۂ حیات اور دستور ایک (یعنی قرآن) ہوگا تو ان میں باہمی اختلاف و افتراق کیسے ہوگا! یہ ہوگی مختلف مملکتوں کی پوزیشن، وحدتِ خداوندی پر ایمان کی صورت میں۔ لیکن مروجہ اسلام میں تو حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کی مملکتیں سیکولر نظام کی مدعی ہیں اور اس کے باوجود وہ دعوے کرتے ہیں اور ہم اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ خدا کی وحدت پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کی یکتائیت پر بھی۔ یاد رکھئیے! اگر خدا کی توحید پر ایمان کے دعویٰ کا نتیجہ امت کی وحدت نہیں تو قرآن کریم خدا پر اس قسم کے ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ آپ دنیا میں دیکھئے۔ چند دہریوں کو چھوڑ کر سارے انسان خدا کو مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں اس قدر اختلافات اور افتراقات ہیں۔ اگر محض خدا کو خدا یا ایک خدا مان لینے سے وحدتِ انسانیت پیدا ہو سکتی تو پھر ان خدا پرستوں میں اس قدر اختلافات کیوں ہوتے؟ اور اگر آپ دنیا بھر کے خدا پرستوں کی بات نہیں کرنا چاہیں، تو صرف مسلمانوں کو لے لیجئے۔ ان کا تو ایک خدا پر ایمان ہے۔ پھر ان میں اس قدر اختلافات کیوں ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہم خدا پر ایمان لانے کے عملی مفہوم کو سمجھے ہی نہیں۔ دورِ حاضر کا عظیم سائنٹسٹ، ایڈنگٹن، اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

> اصل سوال خدا کی ہستی پر اقرار کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD)

لہٰذا، خدا کو ماننے کے معنی ہیں اس کی طرف سے نازل کردہ وحی کو ماننا۔ لیکن جس انداز سے ہم وحی (قرآن) کو مانتے ہیں وہ بھی قرآن کا ماننا نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۲/۸) وہ لوگ بھی ہیں جو اس کا دعوےٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتے۔ قرآن پر ایمان کے معنی کیا ہیں اسے قرآن کریم ایسے واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کسی بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ کہتا ہے کہ

> وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)
>
> جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہتے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ خدا پر ایمان کے معنی ہیں اس کی کتاب پر ایمان رکھنا۔ اور اس کی کتاب پر ایمان کا عملی مفہوم

ہے اس کے مطابق حکومت قائم کرنا۔ یہی کفر و ایمان کا معیار ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جن مملکتوں کا بنیادی ضابطہ قوانین ایک ہو' ان میں وحدت ہوگی یا نہیں؟ قرآن کریم نے ضابطۂ حیات کی وحدت کو صرف مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بتایا۔ اس نے کہا ہے کہ اس سے عالمِ انسانیت میں وحدت پیدا ہو جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق (جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں) ایرک فروم نے کہا ہے کہ "وہ مذہب منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔" اور مرڈل نے کہا ہے کہ اس طرح "تمام دنیا میں واحد حکومت قائم ہو سکے گی جس کا نتیجہ وحدتِ انسانیت ہوگا۔" یہ ہے خدا کی توحید اور قرآن کی وحدت پر ایمان لانے کا حقیقی مفہوم۔ ہماری غلط نگہی' اور ہمیں دیکھ کر ان لوگوں کی بھی غلط فہمی جو اسلام کو ایک چلا ہوا کارتوس سمجھتے ہیں' یہ ہے کہ ہم اسلام کو مذہب سمجھتے ہیں' اور مذاہب کے متعلق یہ حقیقت ہے کہ کوئی ایک مذہب نہیں بلکہ سبھی مذاہب چلے ہوئے کارتوس ہیں۔ پروفیسر (HOCKING) کے الفاظ ہیں:۔

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینانِ خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آ سکتی) ان کے عقاید و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔
>
> (LIVING RELIGIONS AND A WORLD FAITH.)

لہٰذا جب تک اسلام کو مذاہب کی صف سے نکال کر دین (ضابطۂ حیات) کی حیثیت سے نہیں سمجھا جائے گا' اس کے زندۂ جاوید ہونے کی حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکے گی۔ اسلام مذہب کی جامد رسوم کا مجموعہ نہیں۔ وہ زندگی کے غیر متبدل اصول و اقدار کا ضابطہ ہے۔ یہ غیر متبدل اصول قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں اور وہ برابر آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

اسلام ہی غالب ہوگا

قرآن کا دعوےٰ یہ ہے کہ خدا نے الحق پر مبنی دین (نظامِ حیات) اس لئے بھیجا ہے لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۹/۳۳) تاکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظامِ حیات پر غالب آ کر رہے۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کے پیشِ نظر گوئٹے نے (ECKERMANN) سے کہا تھا کہ

> اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے' اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ (بحوالہ خطباتِ اقبال)۔

میں نے اس مختصر سی نشست میں اسلامی نظام کے جس قدر اصول آپ کے سامنے پیش کئے ہیں آپ سوچئے کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ رفتہ رفتہ وہی اصول انسانوں کے خود ساختہ اصولوں کی جگہ لے رہے ہیں! چونکہ یہ اصول ابدی تھے اس لئے یہ بھی نہیں کہ انہوں نے کسی خاص زمانے میں تو اپنے انسانیت ساز نتائج مرتب کئے ہوں اور اسکے

بعد سے درخت سوکھ گیا ہو۔ ان اصولوں کے متعلق کہا ہے کہ — مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ ان کی مثال اس پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۵) یہ شجر طیب ہر موسم میں پھل دیتا جائیگا کبھی خشک نہیں ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں محتاج ؛ بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

نہ ہی یہ اصول یہودیت کی طرح کسی خاص نسل یا قوم کے اندر محدود و محصور رہنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ قرآن ذکرٌ للعالمین ہے یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات۔ اگر کوئی قوم انہیں اپنانے کے بعد چھوڑ دے تو یہ اصول معطل ہو کر نہیں رہ جاتے۔ انہیں جو قوم بھی اپنا لیگی ان کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہوگی۔ اس نے خود مسلمانوں سے برملا کہہ دیا تھا کہ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے ان سے منہ موڑ لیا تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگا اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

محفل ما بے مے و بے ساقی است ؛ ساز قرآں را نواہا باقی است
زخمہ ما بے اثر افتد اگر ؛ آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکر حق از امتاں آمد غنی ؛ از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکر حق از ذکر ہر ذاکر جداست ؛ احتیاج روم و شام او را کجاست
حق اگر از پیش ما بر دارد ش ؛ پیش قومے دیگرے بگذارد ش

یاد رکھئے! دنیا کی کوئی قوم نہ خدا کی چہیتی اولاد ہے نہ سوتیلی۔ وہ رب العالمین ہے تمام اقوام کا نشوونما دینے والا۔ اسلئے جو قوم بھی اسکے عطا کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہوگی انکے نتائج سے بہرہ یاب ہو جائیگی۔ جو انہیں چھوڑ دے گی ذلیل و خوار ہو جائے گی۔ وذالک الدین القیم ۔

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا ؛ قسمت بادہ باندازۂ جام است اینجا

حرفِ آخر

جو کچھ میں نے آپ احباب کی خدمت میں پیش کیا ہے آخر میں اسے چند ایک الفاظ میں دہرا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے یہ صدقہ ہے خدا کی اس رحمت کا جسے اس نے تمام اقوامِ عالم کے لئے عام کر دیا تھا۔ (وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ) دنیا قرآنی اصولوں اور انکی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کچھ ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ آگے چل کر اپنائے گی۔ اسلئے کہ انکے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشوونما و ارتقا کی تکمیل تک پہنچ سکتی ہیں نہ حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا بزمِ ہستی میں جہاں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتابِ عالمتاب کی ضیا باریوں کا صدقہ ہے اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول کھلتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جانِ بہار کی نکہت پاشیوں کا رہینِ منت ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو ؛ آنکہ از خاکش بروید آرزو !
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست ؛ یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

والسلام

بیادِ علامہ اسلم جیراجپوریؒ

[مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے استاذ، علامہ محمد اسلم جیراجپوریؒ، عصرِ حاضر میں فکرِ پیامِ قرآنی کے عظیم مبلغ، اور اُن "السابقون الاولون" میں سے تھے جنہوں نے اسلام کے ایک مکمل نظامِ حیات ہونے کے تصور کا احیاء کیا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۵ء کو دہلی میں، اُن کی وفات ہوئی اور ہفتہ وار طلوعِ اسلام کا آخری ایشوع ۷ جنوری ۱۹۵۶ء کو ان کی یاد میں شائع ہوا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ امسال جنوری کے مہینے میں اجتماعِ حج کی وہ تقریب آئی ہے جو اسلامی نظام میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم اسی نسبت سے علامہ مرحوم کے اس مضمون کی اشاعت کی سعادت حاصل کرتے ہیں جو اُن کی معرکۃ الآرا تالیف، تاریخ الامت کی آخری جلد کا آخری باب ہے۔ انہوں نے اسے ۱۹۲۲ء میں رقم فرمایا تھا ۔۔۔ طلوعِ اسلام]

قرآن کریم میں ہر صاحبِ بصیرت غور کرنے سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اسلام مجموعی لحاظ سے اجتماعی دین ہے۔ یعنی وہ جملہ نوعِ بشری کی اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے۔ بیشک وہ انفرادی تعلیمات بھی پوری پوری اپنے اندر رکھتا ہے لیکن ان تعلیمات سے وہ افراد کا تزکیہ باطن اور ان میں تقویٰ پیدا کر کے ان کو ملت کا جزوِ صالح بنانا چاہتا ہے تاکہ پوری ملت کی اجتماعی زندگی صالح العمل ہو جائے۔ یہ نظام اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے اس کے خلاف جو نظام بھی قائم ہوگا وہ غیر اسلامی اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ یہ پانچ ارکان کی ادائیگی پر قائم ہے جن سے انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کی تکمیل ہو سکتی ہے یعنی توحید۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ اور حج۔

یہ آخری رکن جو اسلام کے مرکزی مقام "مکہ" میں ادا کیا جاتا ہے امت کی اجتماعی خرابیوں کی اصلاح کے لئے ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہم آج بھی اپنی بگڑی سنوار سکتے ہیں اگر خلوص دل سے کوشش کریں۔ اس لئے اس کی کیفیت کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتا ہوں۔

بیت اللہ توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موحدوں کے پیشوائے اعظم ہیں۔ انہوں نے بحکمِ الٰہی اس گھر کو اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے بنایا۔ اس وقت جبکہ دنیا میں کوئی دوسری مسجد نہ تھی۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا

وَ هُدًى لِّلْعَالَمِينَ (۳/۹۶)

پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور دنیا جہان کے لئے ہدایت۔

جب یہ گھر بن گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ یہاں حج کے لئے آیا کریں۔

وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (۲۲/۲۷)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے۔

یہ اعلان کُل انسانوں کے لئے کیا گیا جیسا کہ فی الناس کے لفظ سے ظاہر ہے لیکن مراد یہاں بنی نوع انسان کے موحدین ہیں کیونکہ اس گھر کی بنیاد ہی توحید پر ہے اور قرآن نے اس میں غیر موحدوں کا داخلہ بند کر دیا ہے

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ (۹/۲۸)

مشرک تو نجس ہیں وہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔

یہاں ضمناً یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اسلام نے جو روز اول سے وہی دین الٰہی ہے جملہ انسانوں کو ایک سا قرار دیا ہے اور نسل۔ رنگ۔ ملک یا زبان کے اختلاف نے ان میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ صرف ایک تفریق کو وہ ضروری قرار دیتا ہے۔ یعنی اسلام و کفر کی۔ جو لوگ عہد الست پر قائم ہیں اور انبیاء کے ذریعہ سے ملی ہوئی صحیح تعلیم کے تابع۔ وہ حزب اللہ ہیں۔ اور جو شرک یا کفر میں مبتلا ہیں حزب الشیطان ہیں۔ یہ تفریق بلا امتیاز قوم و نسل قائم رہی ہے اور قیامت بلکہ جنت اور دوزخ تک رہے گی۔

الغرض کعبہ کو اللہ نے موحدوں کا بین الاقوامی مرکز قرار دیا اور خاتم النبیین کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لئے ملت اسلامیہ کا قبلہ نماز بھی اسی کو بنایا۔

آج حضرت ابراہیمؑ کے اعلان کو کم و بیش چار ہزار سال ہو گئے۔ حج کا سلسلہ برابر جاری ہے اور ہر سال اس مرکز میں دنیا کے چاروں گوشوں سے موحد آ کر جمع ہوتے ہیں۔ اللہ نے نہ صرف اس مکان کو بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی حیثیت کے لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ بیت الحرام کو انسانوں کے لئے دار و مدار قرار دیا نیز ماہ حرام کو۔

اس آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ کعبہ موحدوں کی بین الاقوامی انجمن کا مرکز ہے جہاں سے اجتماعی امور کی اصلاح عمل میں آئے گی اور جس زمانے میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ ذی قعدہ، ذی الحجہ، اور محرم تینوں مہینوں کو محترم قرار دیا گیا ہے۔ ہر قسم کے جھگڑے روک دیئے جائیں گے تاکہ لوگ امن کے ساتھ ان میں شریک ہو سکیں۔

اس اجتماع کی غرض بھی صرف ایک مختصر جملہ میں بیان کر دی۔

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲/۲۸)

تاکہ اپنے فائدے کے لئے حاضر ہوں۔

یہ فائدے کچھ اُخروی ثواب ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ دینی، دنیاوی ملکی اور ملی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں

داخل ہیں اور یہی رکن ہے جس سے ملت کی ہر قسم کی خرابیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

یہی مرکزیت باعث ہوئی کہ قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان کیا۔

سَوَآءً ۨ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵)

اس میں باشندے اور باہر والے یکساں ہیں۔

جس کی وجہ سے صحابہ کرام کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمرؓ اور عبداللہؓ وغیرہ شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا اور وہاں کے کسی باشندے کا یہ حق نہیں تسلیم کیا کہ وہ کسی آفاقی اور باہر سے آنے والے حاجی کو اپنے گھر میں قیام سے روک سکے بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانے کو بھی منع کرتے تھے اور اگر کتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔

حج کی صحیح صورت یہ ہے کہ جس جس ملک یا قوم کے مسلمان مکہ میں آئیں پہلے سے اپنا اپنا ایک ایک امیر حج منتخب کر لیں۔ یہ امراء حج نہ صرف یہ کہ اپنے ملک یا اپنی قوم کے حاجیوں کے قیام و طعام کا مکہ میں بندوبست کریں بلکہ ان کے نمائندے اور ترجمان بھی ہوں پھر یہ سب کے سب امراء مکہ میں باہم مل کر بیٹھیں تبادلۂ خیالات کریں تاکہ ہر اسلامی ملک اور قوم کی دینی اور دنیاوی حالت اجتماعی لحاظ سے ان کے سامنے آجائے۔ انہیں امراء میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے مجمع عام میں ایک خطبہ دے۔ جس میں ملت کی پوری اجتماعی حالت پر تبصرہ اور ان کی رہبری ہو اور ایک سال کا اجتماعی لائحہ عمل۔

عرفات سے پلٹ کر حجاج مقام منا میں آجاتے ہیں۔ یہاں تین دن ٹھہرتے ہیں قربانیاں کرتے ہیں اور کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ یہاں بھی تنظیم کی ضرورت ہے اور ہر قوم کے افراد اپنی قربانی کی رقمیں اپنے امراء کو دیں۔ وہ ضرورت اور اندازے کے مطابق قربانیاں کر کے ایک جگہ پکوائے اور سب ایک ساتھ مل کر کھائیں اقوام مسلمہ جن کا داخلی تعارف امراء کے ذریعے سے مکہ میں ہو چکا ہے یہاں ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کر کے آپس میں تعارف پیدا کریں تاکہ باہمی الفت اور اخوت سے وحدت ملی کا احساس بڑھے۔

تشریق کے ان تین دنوں میں ہر جماعت کے امیر کو عرفات کا خطبہ اپنے ہمراہیوں کو اپنی زبان میں سمجھا دینا چاہیئے۔ اب جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے گا وہ عرفات کے منبر کا پیغام ساتھ لائے گا اس سے تمام عالم اسلامی میں اجتماعی روح بیدار ہو جائے گی۔

ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لئے نصب فرمایا تھا ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں تک نفوذ کرتی ہیں یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہنچتی ہے ان سب منبروں کا مخزن میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدت ہائے دراز سے خاموش ہے یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب بے نور افسردہ اور منتشر ہیں تنظیم کی صورت صرف نصب مرکزیت ہے اور کچھ نہیں کیونکہ مرکز کی طرف ہر فرد خود بخود متوجہ ہو جاتا ہے جس سے ساری قوم منظم ہو جاتی ہے جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں افراد یا جماعتوں۔ یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ امت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں ان کو ہمیشہ ناکامی ہو گی اس لئے کہ یہ الٹا راستہ ہے۔

اس طرح پر ہم اپنے حج کے بین الاقوامی اجتماع سے کام لے کر ہر اسلامی خطہ کی آزادی کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انقلابات جو عجلت کے ساتھ اقوام دنیا پر آ رہے ہیں ان میں ایسا وقت آ جائے کہ مسلمان جن خطوں میں آباد ہیں ان میں آزاد جمہوریتیں قائم ہو جائیں پھر ہماری یہی مکہ کی بین الاقوامی انجمن ملت کا مرکز بن جائے گی۔

اب میں اپنی ایک نظم پر جو عرصہ ہوا طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کو ختم کرتا ہوں۔

عروج پا نہیں سکتی جہاں میں وہ ملت　　　کہ جس کا کوئی نہ مرکز ہو اور نہ کوئی نظام
ہو گرچہ ریگِ بیاباں کی طرح لاتعداد　　　ہوا کے جھونکوں میں اُڑتی پھرے گی صبح و شام
اگر ہو نظم تو ملت ہے آہنی دیوار　　　کہ جس کے سامنے طوفاں کو بھی نہیں ہے قیام
یہ نظم کیا ہے فقط ایک نقطۂ مرکز　　　زبانِ شرع میں جس کو کہا گیا ہے امام
ہیں اجتماعی مقاصد اُسی سے وابستہ　　　امام زندہ ہے ملت کی زندگی کا قوام

جہاں کی دوسری قوموں کا ہے نسب پہ مدار　　　مگر ہے ملتِ اسلام جامع الاقوام
اساس اس کی ہے بس "لا الٰہ الا اللہ"　　　اسی اساس پہ قائم ہوئی اُخوتِ عام
نہ کوئی نسل نہ کوئی زباں، نہ کوئی مُلک　　　ہے امتیازِ سیاہ و سفید و سرخ حرام
ہے اس کے ربط میں قوموں کا ارتباط بہم　　　ہے اس کے نظم میں دنیا کی قوموں کا نظام
یہ کیا غضب ہے کہ مسلم کو یہ نہیں معلوم　　　سپرد کی گئی اس کو امامتِ اقوام
امامِ ملتِ اسلام نائبِ حق ہے　　　تمام اہلِ جہاں جس کے حکم کے ہیں غلام

اگر ہے دینِ محمدؐ کا پاس ملت کو
تو آج نصبِ امامت ہے اس کا پہلا کام

ؔ احکام خداوندی کو عملاً نافذ کرنے والا نظام۔ (طلوعِ اسلام)

ایک علمی چراغ گُل ہو گیا

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ علامہ تمنا عمادی ۲۷ر نومبر ۱۹۷۲ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے۔ حیرت ہے کہ طلوعِ اسلام تک کسی کے ساتھ ان کے اتنے قدیمی تعلق تھے، یہ جانگداز خبر اتنی دیر کے بعد پہنچی۔ حلقۂ طلوعِ اسلام میں علامہ مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ویسے تو وہ مختلف علمی میدانوں کے شاہسوار تھے لیکن فنِ اسماء الرجال میں ان کا ثانی آج شاید ہی کہیں موجود ہو۔ اس فن کی رو سے انہوں نے روایات کی جرح و تعدیل کی جو طرح ڈالی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے کہیں جم کر کام نہ کیا۔ بس چند متفرق رسائل یا کتابچوں کے سوا ان کا کوئی مستقل علمی سرمایہ پیچھے نہیں رہا۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

غم زدگان
کارکنانِ ادارہ طلوعِ اسلام

مرتبہ: محمد اسلام نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی

قسط (۲)

طلوعِ اسلام نے کیا کچھ نہیں کہا

گزشتہ پچیس سال کے سفرِ حیات پر نگاہِ بازگشت

طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۰ء صفحہ (۱۰) سے مسلسل

جمہوری حکومت کے ایک وزیر کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہوتی ہے اور اس کشمکش میں وہ عوام کی کس قدر خدمت کر پاتا ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا:-

منسٹروں کی مصروفیتیں

"حکومت کی طرف آیئے تو وہاں اور ہی تماشا دکھائی دیگا۔ آپ (صوباتی یا مرکزی حکومت کے) کسی منسٹر کے کسی ایک ماہ کے پروگرام کا تجزیہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے کتنا وقت صرف کرتا ہے اور اپنی کرسی کے محفوظ رکھنے کی دوڑ دھوپ کیلئے کتنا؟ آپ دیکھیں گے کہ اپنے فرائض پر توجہ دینے کے لئے اسے دن بھر میں بمشکل چند لمحات ملیں گے۔ باقی سارا وقت اسی ادھیڑ بن میں صرف ہو جاتا ہے کہ اس کی پارٹی کی منسٹری کس طرح قائم رہے اور اس میں اس کی اپنی پوزیشن کیسے مستحکم ہو۔ جب صورت حال یہ ہو تو پھر ملک کے نظم و نسق کی جو حالت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے ...... اسکی وجہ بالکل واضح اور بیّن ہے۔ یعنی سیرت کی کمزوری، کیریکٹر کا فقدان۔ اور اس کا علاج؟ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم میں سے ہر ایک خاموش ہو جاتا ہے اور کسی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس لئے کہ ابھی دنیا میں کوئی ایسا انجکشن ایجاد نہیں ہوا جس سے کسی کے دل میں کیریکٹر داخل کر دیا جائے۔ کیریکٹر پیدا ہوتا ہے صحیح تعلیم اور مناسب تربیت سے اور تعلیم و تربیت کا انتظام آپ آنے والی نسل کے لئے تو کر سکتے ہیں، طفلانِ کہن سال کے لئے نہیں کر سکتے۔ ان کا علاج صرف قانون کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کشمکش کے ختم کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آئین میں اس قسم کی تبدیلی کر لیں جس سے وزیر اعظم (اور صوبے کے چیف منسٹروں) کا انتخاب براہ راست ہو۔ اور جب یہ ایک بار منتخب ہوں وہ (صدر مملکت کی طرح) آئندہ انتخاب تک اپنی اپنی کرسی پر متمکن رہیں۔ انہیں وہاں سے ہٹانا ہو تو اس کے لئے وہی طریق اختیار کیا جائے جو صدر مملکت کے لئے آئین میں رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی تجویز کرینگے کہ الیکشن میں جو ممبر کسی پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے اگر وہ پارٹی چھوڑ دے تو اسے رکنیت سے الگ کر دیا جائے۔" (اگست ۱۹۶۳ء)

جمہوریت کے طریق کار پر تنقید کرتے ہوئے طلوع اسلام نے مشورہ دیتے ہوئے لکھا:

آمدنی کے اعتبار سے حلقہ ہائے انتخاب

"اس نظام کو اگر واقعی جمہوری نظام بنانا مقصود ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ حلقہ ہائے انتخاب آمدنی کے معیار کے مطابق متعین کئے جائیں۔ مثلاً سو روپے ماہوار آمدنی والے افراد پر مشتمل ایک حلقہ۔ ان افراد کی تعداد کی نسبت سے اس میں نشستوں کا تعین، اور اس کے بعد شرط یہ کہ اس حلقے سے اُمیدوار وہی کھڑے ہو سکتے ہیں جن کی آمدنی اتنی ہو۔ اسی شکل کو آگے بڑھاتے جائیے۔ مثلاً پانچسو روپے ماہوار آمدنی والوں کا ایک حلقہ انتخاب اور امیدوار بھی انہی میں سے۔ اسی طرح بڑھاتے بڑھاتے آپ لاکھوں روپے ماہوار آمدنی تک لے جائیے۔ ظاہر ہے کہ جوں جوں ہم اوپر اٹھتے جائیں گے نشستوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی اور آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے کا پورا ایوان قوم کے صحیح نمائندگان پر مشتمل ہوگا۔ اس پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہیں گے کہ امیدواروں کے لئے کم از کم تعلیم کی شرط بھی ضروری عائد ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے تعلیمی معیار بھی آمدنی کی نسبت سے رکھا جائے۔ سو روپے آمدنی والوں کے لئے پرائمری یا مڈل کی شرط بھی کافی ہے۔ جوں جوں اوپر اٹھتے جائیں تعلیمی معیار بھی بلند ہوتا جائے۔ صدارت کے لئے البتہ معیار آمدنی نہیں صرف تعلیم رکھا جائے۔۔۔۔۔۔

اس طریق انتخاب کی رُو سے، علاوہ اس کے کہ قوم کے نمائندے فی الواقعہ قوم کے نمائندے ہوں گے، سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ الیکشن کی خرابیاں جن کا ہم اس قدر رونا روتے رہتے ہیں، خود بخود دور ہو جائیں گی۔ سو روپے ماہوار آمدنی والا امیدوار اپنے ووٹر کو رشوت کہاں سے دے گا۔ اور جھوٹے سچے پروپیگنڈہ کے لئے رقم کہاں سے لائے گا، اور لاکھ روپے ماہوار آمدنی والا اگر رشوت دینا چاہے گا تو اس کے ووٹر بھی اسی کی حیثیت کے ہوں گے۔ انہیں خریدنے کے لئے اسے خود بکنا پڑیگا۔

جہاں تک خصوصی مفادات کا تعلق ہے ان کے لئے ایک ایوانِ بالا (SENATE) کا ہونا ضروری ہے خصوصی مفادات سے ہماری مراد ہے مثلاً ڈاکٹر، وکلاء، جج صاحبان، اساتذہ، اہلِ قلم، سائنٹیفک تحقیقات کے ماہر، صنعت و حرفت، تجارت، زراعت وغیرہ۔ ان کے لئے وہی انتخابی حلقے ہوں، وہی ووٹ دینے والے اور انہی میں سے امیدوار۔ ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا کے باہمی تعلقات اور دوائرِ اختیار کا فیصلہ آئینی طور پر کیا جا سکتا ہے۔"

(اکتوبر ۱۹۵۱ء)

مسئلہ تعلیم

قوم، انسانوں کے ہجوم اور انبوہ کا نام نہیں ہوتا بلکہ یہ عبارت ہوتی ہے انسانوں کے اس مجموعہ سے جن میں یک دلی اور یک نگہی، ہم آہنگی و ہمنیالی ہو۔ یک نگہی اور یک دلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس قوم کی تعلیم مشترک ہو تاکہ اس کے افراد کے قلب و دماغ کی تعمیر ایک ہی نقشہ کے مطابق ہو اور ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں ایک ہی قالب میں ڈھل کر باہر نکلیں۔ تعمیرِ ملت کے سلسلہ میں، طلوعِ اسلام نے اس زمانے کے وزیرِ تعلیم کی توجہ سنتِ انبیاء کی طرف مبذول کراتے ہوئے اپنی دوسری اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۸ء میں لکھا:-

۔۔۔۔۔۔ تعمیرِ پاکستان میں سب سے مقدم سوال تعلیم کا ہے۔ اگر ہماری تعلیم صحیح نہج و اسلوب پر شروع ہو گئی تو سمجھئے کہ ہماری ملی عمارت کی بنیاد صحیح خطوط پر اُٹھے گی۔ اور اگر اسکی طرف سے ایسا ہی تساہل برتا گیا

جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر بتایا ہے تو انسانوں کا یہ "منتشر مجموعہ" تا قیامت، قوم نہیں بن سکیگا۔ ہم نے "منتشر مجموعہ" کی متضاد ترکیب دانستہ استعمال کی ہے۔ اس لئے کہ قرآن نے ایسے گروہ کے متعلق جو بظاہر اکٹھا نظر آئے لیکن جن کے دلوں میں اشتراک نہ ہو فرمایا ہے تحسبھم جمیعًا و قلوبھم شتّٰی۔ (تو انہیں "مجموعہ" خیال کریگا حالانکہ وہ مجموعہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے قلوب ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں) اس کا نام "منتشر مجموعہ" ہے۔ قوموں میں وجہ جامعیت قلبی ائتلاف ہوتا ہے نہ کہ پیکروں کا اجتماع۔ تعلیمی اشتراک کے بغیر قلبی اشتراک ناممکن ہے۔"

اس مسئلہ کی اہمیت

اس مسئلہ کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے، جنوری ۱۹۵۵ء میں لکھا:-

وہ کچھ ہوش میں آنے کی میری شکل بھی ناصح
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے!

ہوش میں آنے کی شکل، نہ تو اسمبلیوں میں پیدا ہونے کی نہ وزارتوں کے کابینوں سے؛ نہ یہ مُلّا کے حجروں سے اُبھرے گی نہ شیخ طریقت کی خانقاہوں سے۔ اس کی ابتدا درس گاہوں سے ہوگی۔ قرآن نے اس کی شکل یہی بتائی ہے۔ جب اس نے کہا کہ نظامِ ربوبیت کے قیام کی صورت یہ ہے بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ۔ ضابطہ قانونِ خداوندی کو سمجھنا اور سمجھانا اور اُسے اس قدر دُہرانا کہ یہ دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اور آج اسے پھر دہراتے ہیں کہ جو لوگ اس طریق کار کی اہمیت کو پہچانتے ہوں وہ کچھ وقت کے لئے تصور کرلیں کہ ابھی ہم پہلے دور ہی میں ہیں۔ وہ سرسید بن کر اٹھیں اور ملک میں دو چار ایسی درس گاہیں قائم کر دیں جن میں قرآن کی تعلیم دی جائے۔ مُلّا کے قرآن کی نہیں، خدا کے قرآن کی جو انسان کو تسخیر ارض و سمٰوٰت کے راز ہی نہیں بتاتا بلکہ اس پر اقطار السمٰوٰتِ والارض سے آگے نکل جانے کی راہیں بھی کشادہ کر دیتا ہے۔ ان مجبور انسانوں کو چھوڑ دو کہ جنہوں نے جو کچھ بننا تھا بن چکے۔ اپنی تمام توجہات مرکوز کر دو ان سیال قلوب پر یعنی آنے والی نسلوں پر، جنہیں تم جس قالب میں ڈھالنا چاہو ڈھال سکتے ہو۔ اس سرزمین کی حفاظت کا انتظام رکھو اور اس متاعِ عظیم کے امین تیار کرنے کے لئے درس گاہیں تیار کرو ...... دس پندرہ برس تک نہایت خاموشی سے ان درس گاہوں کو مصروفِ تعلیم و تربیت رہنے دو۔ اس کے بعد دیکھو کہ ان میں کس قسم کے شہباز نکلتے ہیں۔ اس قسم کے شہباز کہ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا

سیاستدانوں کے ہنگامے انہی کے حوالے کر دو؛ بزنس والوں کو چور بازاری کی بھول بھلیوں میں اُلجھا رہنے دو۔ مُلّا کو قوم کی عاقبت سنوار کر اپنی روٹی کمانے کے دھندے میں لگا رہنے دو۔ یہ سب میدان ان کے لئے چھوڑ دو اور تم قوم کے بچوں کو سنبھال لو۔

تم دیکھو گے کہ آخر الامر ان سب کی متاع کاسد ثابت ہوگی۔ ان کے کاروبار میں نقصان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ لیکن جس تخمِ صالح کی تم آبیاری کرو گے وہ ایک دن ایسا تناور درخت بن جائے گا جس کی شاخیں فضائے عالم میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں گی۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا

ثابت وفرعها فی السماء ۔ قوم وہی زندہ رہ سکتی ہے جو مفادِ عاجلہ (دنیا - پیش پا افتادہ مفاد) پر مستقبل کی خوشگواریوں کو ترجیح دے ۔ وبالآخرۃ ھم یوقنون ○ اولٰئک علیٰ ھدًی من ربھم و اولٰئک ھم المفلحون۔

صبر طلبی عشق

آپ کی بے عملی آپ کو یہ کہہ کر فریب دیگی کہ دنیا برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے قوموں کی تقدیریں صبح شام بدل رہی ہیں۔ بین الاقوامی حالات قدم قدم پر پلٹا لے رہے ہیں مزاج روزگار اتنی سرعت سے بدل رہا ہے اور ہمیں ایک ایسا پروگرام بتایا جا رہا ہے جس میں دس پندرہ سال انتظار ہی میں گذر جائیں۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو چالیس دن تک پلاسٹر میں رکھنا ہی ہوگا خواہ اتنی دیر میں قافلہ کتنا ہی آگے کیوں نہ بڑھ جائے۔ تپ دق کا علاج کبھی ایک رات میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں تک سینی ٹوریم میں رہنا پڑتا ہے۔ آپ اس پروگرام کو یہ کہہ کر نہ ٹال دیجئے کہ ۔۔۔ "آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک" ۔۔ اگر آپ نے اس پروگرام کو تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد شروع کر دیا ہوتا تو اس وقت تک اس کی تہائی منزل ختم ہو چکی ہوتی۔ اگر آپ اسے اب بھی شروع کر دیں تو ہر گذرنے والا دن آپ کے عرصۂ انتظار میں کمی کرتا جائے گا۔ تیزی سے بڑھنے والے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے، جو کچھ اور لوگ کرنا چاہیں انہیں کرنے دیجئے۔ لیکن آپ اس سست گام طریق کار کو اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ اس کے نتائج نہایت درخشندہ اور پائیدار ہوں گے۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

خالی قانون سے کچھ نہیں ہو سکتا

صحیح معاشرہ کی تخلیق صرف قانون بنانے سے نہیں، ذہنی تبدیلی سے ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے لکھا:-

"یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آپ سے جو یہ کہا گیا ہے کہ اگر پاکستان میں "آئینِ شریعت" کا نفاذ ہو گیا تو عوام کی حالت اسی دن سنور جائے گی۔ یہ بھی فریب ہے اور محض آپ کے ووٹ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ۔ اول تو جس قسم کا "آئینِ شریعت" ان لوگوں کے ذہن میں ہے اس میں عوام کی حالت نہ کبھی سدھری تھی نہ سدھر سکتی ہے۔ وہ آئین مفاد پرستی اور سرمایہ داری کا محافظ ہے جس میں عوام کو ہمیشہ لوٹا کھسوٹا گیا ہے۔ اس آئین میں بھی دنیا کی خوشگواریاں مفاد پرست طبقہ کے حصے میں آئیں گی اور آپ کو "آخرت میں جنت" ملنے کی تھپکیاں دے کر سلا دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قوموں کی حالت خالی قوانین کے زور پر نہیں بدلا کرتی۔ اس کے لئے ذہنی تبدیلی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہنی تبدیلی صرف قرآنی فکر سے پیدا ہو سکتی ہے اور یہی وہ تبدیلی ہے جس سے صحیح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قانون کا کام معاشرہ کے مستثنیات (EXCEPTIONS) یعنی جرائم پسند طبائع کی روک تھام ہوتا ہے، نہ کہ صحیح معاشرہ کی تخلیق۔"

تعلیم کے معاملہ میں ثنویت ختم کیجئے

اسی امر کی تجدید طلوعِ اسلام نے جنوری ۵۹ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں کی:-

"اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی روح کے مطابق اسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں

کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے۔ وہ قرآنی نظام کی حکمیت و اصلحیت کے علیٰ وجہ البصیرت قائل ہوں اور اس کی رو سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس سے ہماری سیرت میں بلندی اور کردار میں پختگی پیدا ہوگی...... ایسی قوم کے ہنگامی مفاسد کی روک تھام تو ہنگامی احکام و تدابیر سے ہو سکتی ہے، ان کا مستقل علاج اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کی آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت کی پوری پوری ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔ اور اس کے بنیادی خط و خال وہ ہوں گے جنہیں قرآن کریم نے تجویز کیا ہے۔

لہٰذا ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ "مذہبی اور دنیاوی تعلیم" کی اس ثنویت کو ختم کیا جائے۔ جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درسگاہوں میں کیوں دی جائے۔ ہمارے ہاں ایک ہی درسگاہ میں عصر حاضر کے جملہ علوم کے ساتھ دین کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ اور اس طرح مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے ادارہ اور (INSTITUTION) کو ختم کر دینا چاہیئے"۔

دینی تعلیم کو غیر اسلامی تصورات سے پاک کیا جائے۔ اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنی جنوری ۵۹ء کی اشاعت میں لکھا:۔

اسلام کو غیر اسلامی تصورات سے پاک کرو

"درحقیقت یہ ہے کہ وہی افراد، ادارہ یا مملکت، مسلمانوں کی حقیقی بہی خواہ اور نوعِ انسانی کی محسن ہوگی جو اسلام کو غیر اسلامی تصورات و نظریات کی زنجیروں سے آزاد کر کے اسے اپنی منزل تک پہنچنے کا موقع مہیا کرے گی۔ لیکن یہ کام اس کے ہاتھوں سرانجام پائے گا جو تعصب اور جہالت کی ہر یورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہو...... اسلام کو ان غیر اسلامی زنجیروں سے آزاد کرانا کسی محکوم ملک کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانے سے بھی زیادہ مشکل اور ہمت طلب مرحلہ ہے۔ لیکن اس کے بغیر ملک میں کوئی صحیح اور پائیدار تبدیلی نہیں ہو سکتی"۔

مدارس کی کمی اور اس کے حصول کی دشواریوں کا حل پیش کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے جولائی ۵۹ء کے شمارہ میں حکومت کو مشورہ دیتے ہوئے تجویز پیش کی کہ:۔

مساجد سے مدارس کا کام لیجیے

"دورِ اقوامِ عالم میں اگر ہم باشعور قوم کہلانے کے مدعی ہیں تو یہ ضروری ہے کہ اپنی زندگی کے ان مسائل کو دیانتداری سے حل کریں اور مسجدوں سے تربیت گاہوں کا کام لے کر اس کمی کو پورا کریں جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل تباہ ہو رہی ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اول تو مدرسے بہت کم ہیں اور اس کی بنیادی وجہ عمارات کا نہ ہونا ہے۔ دوسرے ان مدرسوں میں دور دور سے بچے آتے ہیں جن کی ٹرانسپورٹ کا کوئی تسلی بخش انتظام نہیں.... اس کے برعکس مسجد قریب قریب ہر محلہ میں موجود ہوتی ہے۔ پھر اس کا فاصلہ بھی ہر گھر سے دس بیس قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔ صبح کی نماز کے بعد ظہر کے وقت تک (کہ یہی عام طور پر بچوں کے اسکول کا وقت ہوتا ہے) وہ بالکل خالی پڑی رہتی ہیں۔ محلے کے بچے کتنی آسانی سے اس میں تعلیم پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مساجد کے امام، خطیب اور مؤذن جو خطبۂ جمعہ اور نمازوں کے علاوہ باقی اوقات

میں بے کار رہتے ہیں بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں — اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک پیسہ خرچ کئے بغیر نئی نسل کے لاکھوں بے کار بچے جنہیں سکولوں میں داخلہ نہیں ملتا، تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ ہو جائینگے۔ اور تباہی کے جس سیلاب میں ان کی زندگیاں بہے چلی جارہی ہیں اس سے بچا کر انہیں صحیح راستے پر ڈالا جا سکتا ہے۔ ہم ارباب حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کریں۔"

معاشی مسائل اور اُن کا حل

قرآنی نظام میں تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری، معاشرہ پر ہوتی ہے۔ قرآنی مملکت جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے وہ افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ نحن نرزقکم و ایاھم (۶/۱۵۲)۔ (تم مطمئن ہو کر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو، ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ طلوع اسلام نے شروع ہی سے قرآن کے عطا فرمودہ اس انسانی حق کو حکومتِ پاکستان سے منوانے کے لئے جدوجہد کی ہے۔ مذہبی پیشواؤں کی معاشی بدحالی کی طرف توجہ دیتے ہوئے اس نے حکومت سے اپیل کی اور طلوع اسلام کی جنوری [illegible] کی اشاعت میں لکھا۔

"وہ یہ مصیبت پاکستان میں ابھی سے نازک صورتحال اختیار کر چکی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوستانی

مذہبی پیشواؤں کی معاش کا انتظام

مسلمان جوق در جوق پاکستان کی طرف آنے شروع ہو گئے... ان میں مختلف پیشوں کے لوگ تھے جنہوں نے یہاں پہنچکر اپنے اپنے پیشے اختیار کر لئے۔ لیکن مذہبی پیشواؤں (مساجد کے ائمہ، مذہبی مدرسوں کے اساتذہ، قاضی، مفتی وغیرہ) جو یہاں پہنچے تو ان کے لئے یہاں جگہ ہی نہ تھی۔ مساجد سب پُر تھیں۔ ہندو اور سکھ جو اپنی عبادت گاہیں خالی کر گئے تھے وہ انہیں الاٹ نہیں کی جا سکتی تھیں، کام انہیں کوئی آتا نہیں تھا۔ اب سوچئے کہ بیکاروں کا اتنا بڑا طبقہ جس نے وہاں ایسی زندگی بسر کی تھی کہ لوگ دیتے بھی تھے اور ہاتھ بھی چومتے تھے، وہ یہاں کس طرح گذر اوقات کرتا؟ پاکستان کے لئے یہ مسئلہ بڑا غور طلب تھا چنانچہ ہم نے اسی زمانے میں ارباب حل و عقد کی توجہ اس طرف منعطف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر اس طبقہ کی معاش کا بندوبست نہ کیا گیا تو یہ قسم قسم کے فتنوں کا موجب بن جائے گا۔ افسوس ہے کہ ارباب اقتدار نے اس طرف توجہ نہ دی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ملک ابتری اور پریشانی کی آماجگاہ بنا دیا گیا۔ اس مصیبت

تعلیم میں ثنویت ختم کی جائے

کا اب بھی یہ حل ہے کہ اس طبقہ کے جو لوگ اس وقت ملک میں بیکار ہیں، ان کی معاش کا انتظام کیا جائے اور آئندہ کے لئے یہاں مذہبی مدرسے بالکل نہ کھلنے دیئے جائیں۔ تاکہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے۔ باقی رہی دینی تعلیم سو اس کا انتظام عام اسکولوں اور کالجوں میں کیا جائے۔ اگر قوم نے اب بھی اس طرف توجہ نہ دی تو یہاں بھی وہی کچھ ہوگا جو انڈونیشیا، ایران اور مصر وغیرہ میں ہو رہا ہے۔"

مملکت کے باشندوں کے لئے فراہمی رزق کی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے طلوع اسلام

نے اپنی فروری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں مشورہ دیتے ہوئے لکھا:۔

معاشی نظام

"ہم اس مقام پر دہرا دیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت کے مطابق تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہوتی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔ ان پر ملکیت نہ افراد کی ہوتی ہے نہ مملکت کی۔ "ذرائع پیداوار" میں صرف زمین ہی شامل نہیں۔ دورِ حاضر میں کارخانے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اب حکومت کارخانوں کے نظام کے متعلق بھی اس قسم کی اصلاحات پر توجہ دیگی اس لئے کہ جو خرابیاں زمین سے حاصل شدہ لامحدود دولت سے پیدا ہوتی ہیں، اسی قسم کی خرابیاں کارخانوں سے حاصل کردہ لامحدود دولت سے بھی رونما ہوتی ہیں۔ قرآن ان خرابیوں کا علاج یہ بتاتا ہے کہ فاضلہ دولت (ضرورت سے زیادہ دولت) کو کسی کے پاس بھی نہ رہنے دیا جائے۔ اسے قوانینِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی منفعت کے لئے عام کر دیا جائے۔ خدا کرے ہماری مملکت بتدریج اس منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح ایک ایسے انسانیت ساز معاشی نظام کو متشکل کر دکھائے جس کے سامنے امریکہ اور روس دونوں کی نگاہیں جھک جائیں۔"

کمیونزم کی روک تھام کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے نشاندہی کرتے ہوئے جنوری ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں لکھا:۔

کمیونزم کی روک تھام کیلئے قرآن کا معاشی نظام

"کمیونزم کی روک تھام صرف اسی صورت میں ہو سکے گی جب قرآنی نظامِ ربوبیت یہاں عملاً نافذ ہو جائے۔ اس نظام کی رُو سے مملکت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ وہ افرادِ مملکت کو بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے گی۔ لہٰذا سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ہمارے آئندہ دستور میں یہ بنیادی شق شامل کی جائے کہ افرادِ مملکت (اور ان کی اولاد) کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوگی اور اس کے بعد عملاً ایسی تدابیر رفتہ رفتہ اختیار کی جائیں جن سے مملکت اپنی اس اہم بنیادی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔ یہی وہ بند ہے جس سے کمیونزم کا سیلاب رُک سکتا ہے۔ نہ صرف کمیونزم کا سیلاب رُک سکتا ہے بلکہ یہ پاکستان کو اقوامِ عالم کی امامت (لیڈرشپ) کا مستحق بنا سکتا ہے۔"

طلوعِ اسلام نے مارچ ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں مغربی اقوام کی تقلید کی تباہ کاریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا:۔

"...... ہمارے پاس قرآن کا عطا کردہ ایسا معاشی نظام ہے جو ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامی کا ازالہ کر دیتا ہے اور دوسری طرف کمیونزم کی انسانیت سوز تباہیوں سے بچا لیتا ہے۔ لیکن اگر ہم نے اپنے آئین کو قرآنی پیکروں میں ڈھالنے کے بجائے اُسے مغربی اقوام کے نقوش پر چلایا، یا اس آئین میں مفاہمتوں (COMPROMISES) سے کام لینا چاہا تو مغربی اقوام تو شاید (اپنی سائنٹیفک ترقیوں کے بل بوتے پر) کچھ دن اور جی لیں، لیکن ہماری تباہی کسی کے روکے نہیں رُک سکے گی۔"

حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کی اہم ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوعِ اسلام نے مشورہ دیا:

اور قوم کا صحیح تعاون حاصل کرنے کے طریق پر تحریر کرتے ہوئے ستمبر ۵۸ء کی اشاعت میں لکھا۔

قوم کو سوچنا سکھایئے

"ہماری قوم جذبات پرستیوں سے کافی بیٹ چکی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ انہیں حقائق کا سامنا کرنے کا عادی بنایا جائے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو مسئلہ پیش نظر ہو اسے نہایت وضاحت سے قوم کے سامنے رکھا جائے۔ اسے اس کے مفید اور مضر پہلوؤں سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیا جائے۔ پھر یہ سمجھایا جائے کہ پاکستان کے دشمنوں کی کیا چال ہے، ان کی تدبیریں کیا ہیں، ہم نے ان کا حل کیا سوچا ہے۔ اس کے بعد قوم سے کہا جائے کہ وہ اس مسئلہ پر غور کرے۔ اسے سوچے سمجھے اور پھر بتلائے کہ اس باب میں اس کا کیا مشورہ ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے آپ قوم کا صحیح تعاون حاصل کر سکتے ہیں اور ان خطرات کا مقابلہ کر سکتے ہیں جن سے آئے دن مملکت پاکستان دوچار ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کی جذباتی اور مبہم تقریروں سے قوم اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ یا تو ان مسائل کو آپ خود بھی اچھی طرح سے نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو آپ نے ان کے حل کے لئے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا۔ اس لئے اپنی بے عملی کو جذبات پرستی کے نقاب میں چھپا رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی خوش آئند نہیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ ایک وقتی گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی گرمجوشی شراب کے نشے کی طرح ہوتی ہے جس کا خمار بعد اضمحلال اور افسردگی پیدا کرتا ہے۔ واثمھما اکبر من نفعھما۔ اس کے اضمحلال کا نقصان اس کی گرمجوشی کے فائدہ سے کہیں زیادہ ہے۔"

حکومت اور عوام

حکومت اور عوام کے رابطہ کے اصل مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنی اپریل ۴۹ء کی اشاعت میں لکھا۔

"ہم حکومت سے پھر گذارش کریں گے کہ وہ اپنے آپ کو جمہور کی آواز بنائے۔ ملت کو یقین دلائے کہ حکومت ملت کی ہے اور خود اس کا ثبوت دے کہ وہ ملت کو اپنی ملت سمجھتی ہے۔ موجودہ طریقے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے نہیں۔ . . . . اب حقائق سے کھیلنے یا چشم پوشی کا وقت نہیں۔ پاکستان ایک حقیقت ہے۔ وہ نہ افسانہ ہے نہ شعر۔ زندگی بجائے خود نہ افسانہ ہے نہ شعر۔ ہم میدانِ جنگ میں ہیں۔ زندگی سعیٔ پیہم ہے اور جہادِ مسلسل۔ شاعری زندگی کے حقائق سے گریز کا نام ہے۔" (طلوعِ اسلام - اپریل ۴۹ء)

طلوعِ اسلام نے اپنی دسمبر ۴۸ء کی اشاعت میں خلفاء راشدینؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کی تنبیہ کرتے ہوئے ارباب حل و عقد کو یاد دلایا:-

"جب تک ہمارے ارباب حل و عقد حضرت عمرؓ کی طرح راتوں کو بھیس بدل کر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھیں گے کہ قوم کی حالت کیا ہے اور اپنے کانوں سے نہیں سنیں گے کہ کہتی ہے ان کو خلقِ خدا غائبانہ کیا۔ اور جب تک قوم کا ہر فرد (عہد فاروقیؓ کی اس بڑھیا جیسی جرأت اپنے اندر نہیں رکھیگا کہ وہ ارباب حل و عقد کو بتا سکے کہ خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔ اس وقت تک یہ مصاحبین ارباب اقتدار کو برابر فریب میں مبتلا رکھیں گے اور ارباب اقتدار دیکھتے بوجھتے برابر فریب کھاتے چلے جائیں گے اس لئے کہ فریب میں بڑی لذت ہوتی ہے اور حقائق کا سامنا کرنے کے لئے بڑے کیریکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔"

عوام کو مشورہ دیتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنی جنوری ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں لکھا:۔

"وہ حکومت ختم ہو گئی جس کے خلاف تمہیں قانون شکنی اور عدول حکمی کے لئے ابھارا جاتا تھا۔ اب اس کی جگہ تمہاری اپنی حکومت آ گئی لیکن تم نے اس قانون شکنی اور ضابطہ فراموشی کی روش کو اصلِ حیات اور حکم عدولی اور نافرمانی

عوام کو مشورہ — قانون شکنی چھوڑ دو

کے مسلک کو عین آزادی سمجھ رکھا ہے اور اب تک تمہاری حالت یہ ہے کہ ذرا کوئی بات خلافِ منشاء ہوئی اور تم نعل بر آتش ہو گئے۔ ذرا سوچو کہ اس طرح دنیا میں کوئی نظم قائم اور کوئی حکومت مستحکم ہو سکتی ہے؟ ..... اگر قانون غلط ہے تو اُسے صحیح قانون سے بدلنے کی کوشش کرو لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر بے آئینی کا انتشار نہ پیدا ہونے دو کہ اس انتشار سے دشمن جو تمہاری گھات میں بیٹھا ہے، فائدہ اٹھا لے گا اور تمہاری یہ حالت ہو جائے گی، جیسے ایک نوزائیدہ چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے گر جاتا ہے۔"

قانون کی فرمانروائی

قانون پر عملدرآمد کرانے کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے حکومت کو مشورہ دیا کہ جرأت اور بیباکی سے چھوٹے اور بڑے اور غریب اور امیر کا امتیاز کئے بغیر آنکھوں پر پٹی باندھ کر ترازوئے عدل ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے۔ اس نے اپنی ستمبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

"ضرورت ہے دیانت مقصد کے ساتھ اس مسئلہ کو ہاتھ میں لینے کی، اس کے لئے ضرورت ہے عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند کی، ضرورت ہے جرأت اور بے باکی کی، ضرورت ہے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ترازوئے عدل کو ہاتھ میں لینے کی اور ضرورت ہے چھوٹے اور بڑے اور غریب اور امیر کا امتیاز کئے بغیر بطش شدید اور گرفتِ محکم کی۔ اسی سے ایسی فضا پیدا ہو سکتی ہے جس میں قانون شکنی کرنے والے کا دل تنہائی میں خوف سے کانپ اٹھے اور ہر امن شریف انسان اطمینان کی نیند سو سکیں جو حکومت ایسی فضا پیدا کر دے وہی کامیاب اور قابلِ فخر حکومت کہلا سکتی ہے۔"

طلوعِ اسلام نے جولائی ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں پاکستان کا دیگر ممالک سے موازنہ کرتے ہوئے حالات کا تجزیہ کیا اور حکومت کی توجہ ان حقائق کی جانب مبذول کراتے ہوئے لکھا:۔

(۱) "پاکستان پر ۱۹۶۵ء کے بھارتی حملہ اور حال ہی میں مصر پر اسرائیلی حملہ نے یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ اب کسی ملک پر مخالف ملک کی طرف سے بلا اطلاع اور الٹی میٹم کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ بنا بریں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہر وقت جنگ کی حالت میں سمجھیں۔

(۲) قریب بیس سال کا عرصہ ہوا، پاکستان، اسرائیل اور چین ایک ہی وقت میں منصۂ شہود پر آئے۔ اس عرصہ کو ان تینوں ملکوں نے کس طرح استعمال کیا اس کا اندازہ ان کی موجودہ

ہم اور چین اور اسرائیل

حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسرائیل کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ یہودی دنیا کی متمول ترین قوم ہے اس لئے ہم دولت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن چین تو دنیا کا غریب ترین ملک تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس کا بنیادی راز اس کے معاشی نظام کی تبدیلی میں ہے۔ عجیب حسن اتفاق ہے کہ وہ

نظام خود قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ اس لئے اس کے اختیار کرنے سے ہم (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) قرنِ اوّل کے صحیح اسلام کیطرف لوٹ سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہمارے زندہ رہنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ ہم امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داری نظام کا مقابلہ سرمایہ داری نظام سے کر ہی نہیں سکتے۔

(۳) ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے ہیں۔ ہماری ساری توجہ اسی طرف مرکوز ہو جانی چاہیئے۔

قرآن کا عسکری نظام

(۴) قرآن کا عسکری نظام یہ تھا کہ ملت کا ہر فرد سپاہی ہو۔ اسرائیل اور چین دونوں نے اپنے ہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ملٹری ٹریننگ لازمی قرار دے دی اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اگر ہم نے اس میں مزید تغافل برتا تو اس نقصان کی تلافی کبھی نہیں ہو سکے گی۔

ذرائع ابلاغ کا صحیح استعمال

(۵) ہماری قوم بے حد جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس کا خوشگوار پہلو تو یہ ہے کہ خطرہ کے وقت یہ بڑی سرگرم عمل ہو جاتی ہے لیکن اس کا نقصان رساں گوشہ یہ ہے کہ یہ دوسروں کے پراپیگنڈہ کا بھی اسی تیزی سے شکار ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ قوم میں صحیح سیاسی شعور پیدا کیا جائے۔ عوام میں اس کا ذریعہ پریس ہے اور طلبا میں صحیح نظامِ تعلیم۔ اور ہم نے اس پچیس سال میں ان دونوں ذرائع تربیت سے مجرمانہ تغافل برتا ہے۔ اگر ان کی طرف فوری توجہ نہ کی گئی تو پھر ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔

ہماری آئیڈیالوجی

(۶) اسرائیل نے ایک مقصد کے حصول کے لئے مملکت قائم کی۔ چین کے پیشِ نظر اپنی مخصوص آئیڈیالوجی تھی۔ پچیس برس میں ان کا ہر قدم اسی مقصد اور منزل کی طرف اٹھتا چلا گیا اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے بھی ایک آئیڈیالوجی کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا لیکن اس کے بعد وہ آئیڈیالوجی ہماری زبانوں تک رہ گئی۔ جب تک اس آئیڈیالوجی کو مقصودِ مملکت قرار نہیں دیا جائیگا، ہم میں مقصد کی خاطر زندہ رہنے اور مقصد کی خاطر مرمٹنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہ آئیڈیالوجی قرآن میں بیان کردہ مستقل اقدار کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک پوری کی پوری قوم میں (اوپر کے طبقہ سمیت) اس مقصد کے لئے "جنون" پیدا نہیں ہو جاتا ہم زندہ رہنے کے مستحق قرار نہیں پا سکتے۔

ہم ایک قوم نہیں بن سکے

(۷) ہم نے دین کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم ہونے کا دعویٰ کیا اور اسی دعوے کی بنیادوں پر پاکستان حاصل کیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم ابھی تک ایک قوم بن ہی نہیں سکے۔ ہم یا افراد کی زندگی بسر کر رہے ہیں یا برادریوں اور علاقائی نسبتوں سے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ملک کا اجتماعی مفاد ہمارے سامنے ہی نہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے مفاد کی دھن میں مصروف اور لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہے۔ یہ اوپر کے طبقہ کا حال ہے۔ باقی رہے عوام سو وہ روٹی کی فکر میں اس قدر پریشان و سرگرداں ہیں کہ انہیں یہ کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ملک کیا ہوتا ہے اور قوم کسے کہتے ہیں۔ جب تک ریت کے ان بکھرے ہوئے ذروں کو محکم بنیاد پر چٹان نہیں بنایا جاتا یہ کسی طوفانِ بلا کا مقابلہ نہیں کر سکینگے۔

(۸) اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ لیڈر طعنہ زن ہیں کہ قوم نکمی ہے۔ اور قوم شکوہ سنج ہے کہ لیڈر کام کے نہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ (۸/۲۵) اس تباہی سے ڈرو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جو ظلم و زیادتی کرتے تھے۔ وہ ساری کی ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ پھر نہ قوم کے ظالم بچا کرتے ہیں نہ مظلوم۔

سیلاب سے تباہ ہو جاتے ہیں

(۹) خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہر قوم کو مہلت کا وقفہ ملتا ہے اور اس کے ختم ہونے سے پہلے اسے ایک وارننگ ملتی ہے۔ اگر وہ اس سے سنبھل جائے، تو نبھا، ورنہ اس پر تباہی بغتۃً (اچانک) آجایا کرتی ہے۔"

حقوق اور ذمہ داریاں

انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اور حیوان مجبور ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا، بڑی لذت بخش اور کیف انگیز خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اسے کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا۔ لیکن فطرت کی طرف سے یہ متاعِ گراں بہا مفت نہیں مل گئی۔ اس نے اس کی بڑی قیمت وصول کی ہے اور وہ قیمت ہے ذمہ داری (RESPONSIBILITY)۔ جتنی زیادہ اختیار کی وسعتیں اتنی بڑی ذمہ داری۔ لیکن جہاں انسان اختیارات کے استعمال سے بے پناہ لذت حاصل کرتا ہے وہاں ذمہ داری کا بوجھ اس پر بہت گراں گذرتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہمیشہ کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ سچے یا جھوٹے حقیقی یا مصنوعی اختیارات کے استعمال سے لذت اندوز اور کیف آشنا تو ہوتا رہے لیکن کسی نہ کسی طرح ذمہ داریوں کے بوجھ سے بچ جائے۔ نوعِ انسان کی تاریخ کا بیشتر حصہ اس کی اسی خود فریب کوشش کی داستان ہے۔ اس میں وہ طبقہ بھی شامل ہے جس نے ذہنی یا جسمانی قوت اور برتری حاصل کر کے ایسے نظریاتِ حیات اور نظامہائے تمدن و معاشرت وضع کئے جن سے ان کی ہوسِ اقتدار کی تو تسکین ہوتی رہے لیکن ان کی چیرہ دستیوں کی ذمہ داری ان پر عاید نہ ہو۔ دوسری طرف کمزور اور زیر دست طبقہ بھی ان تمام چیرہ دستیوں کو محض اپنی کمزوری اور کم ہمتی کی بنا پر برداشت کرتا اور اس طرح ان انسانیت سوز نظریات و نظامہائے تمدن و سیاست کی کامیابی کا ذریعہ بنتا رہا لیکن اپنے اوپر اس کی ذمہ داری لینے سے کتراتا رہا۔ آپ قرآن کریم کی تعلیمات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ وہ کس طرح ان تمام معتقدات اور نظریات کی ایک ایک کر کے تردید کرتا ہے جن کی رُو سے انسان اپنی ذمہ داری سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ پاکستان کو زندگی حاصل کرنے کا یہ آخری موقعہ ملا ہے۔ اب یہ حکومت اور عوام کی اپنی کوشش پر موقوف ہے کہ یہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر زندگی کی نعمتوں سے دوبارہ ہمکنار ہو جائیں یا اپنی تساہل انگیزیوں اور ہوس رانیوں سے اس نایاب موقع کو ضائع کر کے ان قوموں میں جا ملے جن کے متعلق قضا و قدر کا حتمی فیصلہ ہے کہ وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتیں۔

بدرگاہِ ربّ العزت

اور سب سے آخر میں ایک گذارش اس بارگاہ میں ہے جو دنیا کی ہر گذارش کا آخری ملجا ہے۔ بچپن میں ایک قصہ پڑھا کرتے تھے کہ کسی "صاحبِ دل" نے ایک بے نماز کو ایک عرصہ کی تلقین کے بعد نماز پڑھنے پر آمادہ کر لیا۔ اسے نماز سکھائی۔ غسل کرایا۔ کپڑے بدلوائے۔ جائے نماز بچھائی۔ قبلہ رُو کھڑا کیا۔ اور اللہ اکبر کہلوا کر سینے پر ہاتھ بندھا دیئے ـــــ اسکے بعد خود دعا کو ہاتھ اٹھا کر کہا۔

اے مقلب القلوب! اتنا کچھ تو میں نے کر دیا ہے۔ میں یہی کچھ کر سکتا تھا۔ اسکے بعد
تو اسے خود سنبھال لے۔

طلوعِ اسلام بھی اس بارگاہِ صمدیت میں، جھکی ہوئی نگاہوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے عرض کرتا ہے کہ جو کچھ ہم ناتوانوں کے بس میں تھا ہم نے کر دیا۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جو کچھ ہم نے کیا ہے اگر یہ تیری میزان میں پورا اترتا ہے تو اس کے بعد اس امر کا انتظام تو اپنے دوسرے بندوں کے ہاتھوں خود کر دے کہ اس کوشش ناتمام کے ذریعے راہ گم کردہ انسانوں کا یہ کارواں اس راہ پر چل نکلے جو تیری بتائی ہوئی راہ ہے اور جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی واحد اور اقوم راہ ہے۔ باقی رہا ہماری ان حقیر کوششوں کا صلہ ــــ سو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ

جب تیرے حضور تیرا آخری رسولؐ انسانوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ۔ یا رب
إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا۔ (یا اللہ! یہ ہے میری وہ قوم جس نے قرآن کو چھوڑ رکھا تھا) تو ہم اس گروہ کے اندر نہ کھڑے ہوں۔ بس اس سے زیادہ اور کوئی آرزو نہیں۔"

طلوعِ اسلام

ہزاروں کی تعداد میں چھپتا ہے۔

اور اندرون ملک اور بیرونی ممالک میں اس کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس کا ایک ایک پرچہ تعلیمی اداروں، لائبریریوں اور دفاتر میں کئی کئی افراد پڑھتے ہیں اور اس کا مطالعہ پاکستان کے علاوہ متعدد بیرونی ممالک کے نہایت بلند پایہ طبقہ میں ہوتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ

طلوعِ اسلام میں اشتہار دینے سے

آپ کے کاروبار کو کس قدر پبلسٹی مل سکتی ہے ــــ اشتہارات کے نرخ یہ ہیں:

ٹائیٹل کے صفحات:-	ایک بار	سال بھر کا ٹھیکہ
صفحہ نمبر ۲، ۳	-/۲۵۰ روپے	-/۲۰۰ روپے
صفحہ نمبر ۴	-/۳۰۰	-/۲۵۰ "
اندرونی صفحات:-		
پورا صفحہ	-/۱۷۰ روپے	-/۱۵۰ "
نصف صفحہ	-/۹۰ "	-/۸۰ "
چوتھائی صفحہ	-/۵۰ "	-

نوٹ:- (۱) اجرت اشتہار مسودہ کے ساتھ پیشگی آنی چاہیئے (۲) اگر اشتہار کا بلاک بنوانا مقصود ہو تو بلاک کی اجرت الگ لی جائیگی۔ (۳) غیر مہذب اشتہار شائع نہیں کئے جائینگے۔ (۴) نصف صفحہ سے کم اشتہار کا ٹھیکہ نہیں لیا جائیگا۔ (۵) مذکورہ بالا نرخ ایک ہی رنگ کے اشتہار کے لئے ہیں اگر ایک سے زائد رنگوں میں اشتہار چھپوانا مقصود ہو تو وہ صرف ٹائیٹل پر چھپ سکیگا اور ہر اشتہار پورے صفحہ کا ہونا ضروری ہے۔ جس پر دو رنگوں کے لئے پچاس روپے اور تین رنگوں کے ایک سو روپے ہر ماہ مزید خرچ آئے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

بصیرت افروز و انقلاب آفریں کتابیں

قائدِ اعظمؒ کے تصوّر کا پاکستان

پرویز صاحب کے قلم سے یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ● پاکستان کی بنیاد کیا تھی؟ ● بانیٔ پاکستان اقبالؒ اور معمارِ پاکستان قائدِ اعظمؒ نے اس مملکت کا تصور کیا دیا تھا؟ ● دو قومی نظریہ کیا ہے؟ ● نظریۂ پاکستان نہ کبھی فیل ہوا ہے نہ کبھی فیل ہو سکتا ہے ● پاکستان اب بھی ایک قابلِ فخر ملک بن سکتا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ایک نسخہ ہر اس گھر میں ہو جس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہوں یا کر چکے ہوں۔

قیمت:- دس روپے ($10/-$) (علاوہ محصول ڈاک)

قرآنی فیصلے

زندگی کے بیسیوں مسائل اور معاشرے کے معاملات کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کرتے ہیں؟ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات، خیرات، قربانی، ترکہ، وصیت، نکاح، طلاق اور شراب، جوا، حرام و حلال یا مثلاً شبِ برات، عید میلاد، تصویر کشی، موسیقی، سینما، مشاعرے، عذابِ قبر، نبی اکرمؐ و علمِ غیب، حضورؐ کا معراج، الہام، مرکزِ ملت، غلام اور لونڈیاں وغیرہ جن کے متعلق قرآن کے فیصلے کا آپ کو علم نہیں، ان کے بارے میں سب کچھ آپ کو ایک جگہ اس کتاب میں مل جائے گا۔

قیمت:- مکمل سیٹ تین جلد - پندرہ روپے ($15/-$) - فی جلد پانچ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

قرآنی قوانین

ایک مختصر لیکن جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ جج صاحبان اور وکلاء حضرات کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس میں ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مستقل اقدار کو بھی مدون کر دیا گیا ہے جن کی روشنی میں امت عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کرے گی۔

(قیمت:- چار روپے ($4/-$)۔ (علاوہ محصول ڈاک)

تاریخ الامت

قرآنی فکر و بصیرت کے طائرِ پیش رس و دیدہ ور مؤرخ علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے قلم سے امت کی تمام سرگذشت مختصر، سلیس اور سادہ انداز میں جسے ادارہ نے بڑی محنت سے شائع کیا ہے اور کئی درس گاہوں میں شاملِ نصاب ہے۔ آٹھ جلدوں کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) سیرتِ رسولؐ۔ (۲) خلافتِ راشدہ۔ (۳) خلافتِ بنی امیہ۔ (۴) خلافتِ عباسیہ۔ (۵) خلافتِ عباسیہ (بغداد) (۶) تاریخ مصر (۷) آلِ عثمان۔ (۸) پوری تاریخ پر عالمانہ تبصرہ۔ قیمت: مکمل سیٹ پچیس روپے ($25/-$)۔ جلد پنجم - چار روپے ($4/-$)۔ بقیہ فی جلد تین روپے ($3/-$) (علاوہ محصول ڈاک)

جہانِ فردا

اس سوال کا جواب کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ مفکرِ قرآن جناب پرویز نے اپنی مدت العمر کے غور و فکر کے بعد اس معرکۃ الآرا تصنیف میں صاف، سادہ لیکن دلکش انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب بڑی مفید، بصیرت افروز اور حقیقت کشا ہے جس میں موت و حیات، برزخ، حشر، نشر، قیامت، حساب کتاب، اعمال نامہ، میزان، جنت، دوزخ اور حیات و جاوداں تمام مباحث آ گئے ہیں۔ قیمت آٹھ روپے دارزاں ایڈیشن علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور ● ادارہ طلوعِ اسلام 25 بی گلبرگ 2 - لاہور

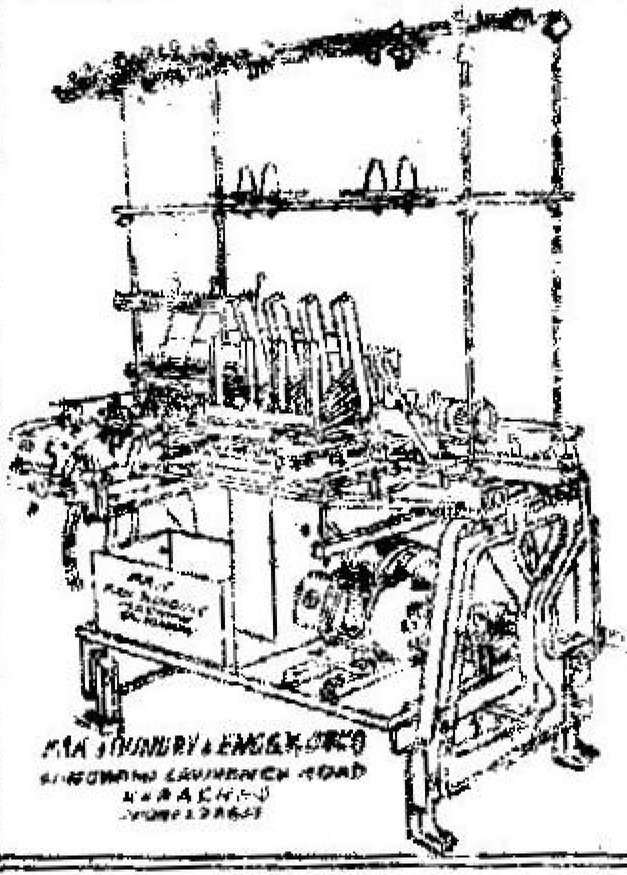

SOLE MANUEACTURERS

of

FOUR SPINDLE AUTOMATIC PIRN WINDING MACHINES

PAK FOUNDRY & ENGG. WORKS

RAMSWAMI

LAWRENCE ROAD

KARACHI.3 PHONE: 7431

کپڑے دھونے کیلئے بہترین صابن

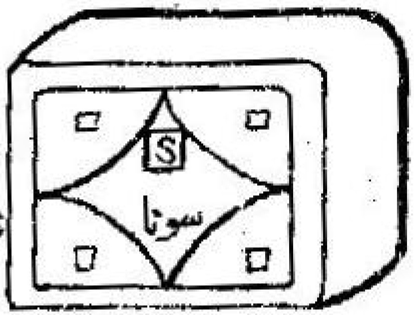

ہمیشہ استعمال کیجئے!

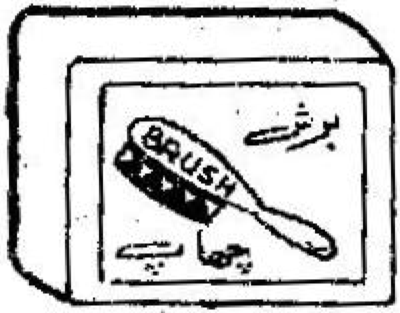

برش چھاپ ——— اور ——— سونا مارکہ

سوتی، اونی اور ریشمی کپڑوں کو صاف و شفاف کرتا ہے ——— ہر جگہ دستیاب ہے!

ثریا سوپ فیکٹری کراچی

SURYA SOAP FACTORY KARACHI.

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PTI 5/22

اسے نوٹ کر لیجئے

(۱) اگر آپ ایک سو روپیہ جمع کرا کر پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل ہو جائیں تو ادارہ کیطرف سے شائع کردہ جو کتاب بھی آپ چاہیں آپ کو محصول ڈاک ادا کئے بغیر مل جائے گی اور اس کا باقاعدہ حساب رکھا جائے گا۔

(۲) پرچہ نہ ملنے کی صورت میں متعلقہ ماہ کی پندرہ تاریخ تک اطلاع بھیج دیجئے۔ اس کے بعد اطلاع ملنے پر اگر پرچہ موجود ہوا تو قیمتاً مل سکیگا۔

ناظم

سرحد، پنجاب اور بلوچستان کے رہنے والے حضرات کیلئے

خوشخبری

آپ جب بھی کراچی تشریف لائیں

هزاره حسن زئی هوٹل

نذد الاسلام روڈ۔ پٹیل پاڑہ۔ کراچی ۵

پر ضرور تشریف لائیں

جہاں

عمدہ، لذیذ، دنبہ خیبر اور لنڈی کوتل کا مشہور چرغہ و ہر قسم کی چائے شب و روز تیار ملتا ہے

فائر
ایکسیڈنٹ
میرین
اور دیگر متفرق
بیمہ کاری کے لئے
مکمل
تحفظ
دی اسٹینڈرڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ